جلد ۸۰ جنوری ۱۹۷۴ء نمبر ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۸۰	جنوری ۱۹۷۴ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۹۳ھ ہجری	عدد ۵

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک ، اچھرہ ، لاہور

زر سالانہ دس روپیہ ——— فی پرچہ ایک روپیہ

ابو الخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر : محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

یوں تو پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد ہی لیکن خاص طور پر سابق گورنر جنرل ملک غلام محمد کے دورِ اقتدار سے لے کر آج تک اربابِ حکومت کے طرزِ عمل میں جو ایک خوفناک رجحان مسلسل پرورش پا رہا ہے اور جس نے چند سالوں سے بڑی تشویشناک صورت اختیار کر لی ہے، وہ یہ ہے کہ قوم کو ہر اُس معاملے میں جو اس کے لیے زندگی اور موت کی حیثیت رکھتا ہے، بالکل بے خبر رکھا جائے اور حقائق کو اس سے پوری طرح چھپایا جائے۔

حقائق کو اخفا میں رکھ کر دوسروں کے ساتھ معاملات کرنے کا کام عام طور پر دو قسم کے لوگ دو مختلف حالات میں کرتے ہیں۔ ایک دردمند معالج جو مریض کی صحت یابی سے مایوس تو ہو، مگر مریض اور اُس کے ان عزیز و اقارب کے جن کے بارے میں اُسے یہ احساس ہو کہ اگر ان پر یہ راز کھل گیا تو یہ اس صدمے کی تاب نہ لا سکیں گے، اصل صورتِ حال کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن اگر اس کے طرزِ عمل کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی اخفا کی کوششوں میں بڑی دردمندی اور دلسوزی پائی جاتی ہے اور مریض کی صحت کے بارے میں اس کے لواحقین کی طرح وہ خود بھی بڑا ہی مضطرب ہوتا ہے اور مریض کی موت پر صدمات کی جو چوٹ اس کے عزیزوں کو سہنی ہے وہ خود بھی اسے دل کی گہرائی میں پوری شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ مریض اور اس کے وابستگان کے ساتھ اس کا رویہ غیر معمولی طور پر ہمدردانہ ہوتا ہے۔

اس دردمند، اہلِ دل اور حساس معالج کے علاوہ کچھ دوسرے لوگ بھی معاملات کو اخفاء میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسے اپنی ہنرمندی اور چابکدستی خیال کرتے ہیں۔ مثلاً اگر دو یا چند اشخاص مل کر کاروبار کر رہے ہوں تو عیّار شریکِ کار اپنے دوسرے رفیق یا رفقاء سے اصل صورتِ حال کو ہمیشہ چھپانے کا التزام کرتا ہے اور انہیں تاثر یہ دیتا ہے کہ اس کی ذہانت اور فطانت کی وجہ سے کاروبار غیر معمولی رفتار کے ساتھ ترقی کر رہا ہے، منافع کی رفتار بڑی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے اور ان کی کاروباری ساکھ کو ہر آن چار چاند لگ رہے ہیں مگر ان کے شرکاءِ کار کو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ یہ صاحب جو کچھ فرما رہے ہیں اُس میں کس حد تک صداقت ہے۔ بہی کھاتے چونکہ اسی شخص کے قبضے میں ہوتے ہیں، اس لیے وہ اصل حقائق کو جاننے سے ہمیشہ قاصر رہتے ہیں۔ البتہ کاروبار کی ظاہری صورت دیکھ کر انہیں سخت تشویش لاحق ہوتی ہے اور وہ

جب اپنے اندرونی اضطراب کا اس کے سامنے اظہار کرتے ہیں تو وہ یہ کہہ کر انہیں خاموش کر دیتا ہے کہ تم دشمنوں کی باتیں سُن کر ان سے دھوکا کھا گئے ہو، اور اس وجہ سے بے چینی کا اظہار کر رہے ہو۔ تمہیں کیا معلوم کہ میں محنتِ شاقہ سے کاروبار کو کس بلند مقام پر لے جا رہا ہوں۔ تم اندھے ہو، تم دیوانے ہو، تمہیں میری محنت، میری ذہانت، میرے جذبۂ ایثار اور میرے خلوص کی کوئی قدر نہیں۔ تمہیں اس بات کا کچھ احساس نہیں کہ محض میرے وسیع تعلقات کی وجہ سے تمہیں کس قدر فائدہ حاصل ہوا ہے اور کاروباری دُنیا میں تمہارا نام اب کس عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

زندگی کیونکہ شاعری کا نام نہیں بلکہ ٹھوس حقائق سے عبارت ہے اس لیے عیار شخص کی عیاریاں زیادہ مدت تک کام نہیں آتیں اور حقائق جلد ہی فریب کاریوں کے سارے پردے بڑی بے رحمی سے چاک کر کے لوگوں کے سامنے نمایاں ہو کر آجاتے ہیں اور ایک شدید ذہنی جھٹکے کے ساتھ انہیں پتہ چلتا ہے کہ ان کے ساتھ شرمناک کھیل کھیلا گیا ہے۔

گزشتہ بیس سال سے پاکستان کے حکمران اس ملک اور اس کے عوام کے ساتھ اس طرح کی فریب کاریوں میں مصروف ہیں جس طرح کہ کسی کاروباری ادارے کا عیار رکن اپنے سادہ لوح رفقاء کو بیوقوف بنا کر انہیں دونوں ہاتھوں سے لوٹتا ہے مگر انہیں ہر لحظہ یہی تاثر دیتا رہتا ہے کہ ان کا کاروبار خوب چمک رہا ہے اور اُن بیچاروں پر اصل حقیقت اُس وقت کھلتی ہے جب عدالت کا بیلف قُرقی کے وارنٹ ہاتھ میں لے کر ان کے مال کو قُرق کرنے کی غرض سے اُنہیں آگھیرتا ہے۔

ملک غلام محمد کے عہد کو تو جانے دیجیے کیونکہ اُس کے بارے میں کوئی شخص کسی قسم کی خوش فہمی میں مبتلا نہ تھا۔ ہر آدمی جانتا تھا کہ ایک ذہنی اور جسمانی لحاظ سے مفلوج انسان کو کسی گہری سازش اور حکمران ٹولے کی باہمی آویزش نے مسندِ اقتدار پر براجمان کر دیا ہے۔ اس لیے اُس کے دورِ اقتدار میں ملک و ملت کو جو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا وہ عین توقع کے مطابق تھا کیونکہ اس سے کسی خیر اور بھلائی کی توقع ہی عبث تھی۔ اُس نے جس طرح خواجہ ناظم الدین کی وزارت کو برطرف کیا اور پھر اپنی اس مجنونانہ حرکت کو صحیح ثابت کرنے کے لیے جو شرمناک ہتھکنڈے استعمال کئے ان میں سے کوئی ایک بھی اس کی سیرت اور ذہنی افتاد کے پیشِ نظر غیر متوقع نہ تھا۔ نہ صرف ملک کے اصحابِ بصیرت بلکہ معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والے لوگ بھی اس کی ان کارروائیوں پر سخت آزردہ خاطر تھے اور اس حقیقت کو پوری طرح سمجھ رہے تھے کہ ملک تباہی کی طرف جا رہا ہے۔ اس لیے اس کے ہاتھ سے جو کچھ ہوا، اس سے لوگوں کو تکلیف تو ہو رہی تھی مگر اُن کے اذہان جھٹکوں سے محفوظ تھے۔ اس شخص کی ساری حرکات و سکنات، اُس کی ساری عیاریاں اور فریب کاریاں، اس کی ساری زیادتیاں اور زبردست آزاریاں

ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح سب کے سامنے تھیں اور سب ان پر نفریں بھیج رہے تھے۔ اس کے عہد میں ملک کے اندر جمہوریت کا جس طرح خون ہوا، عدلیہ نے حق و انصاف کو جس طرح مصلحت کی بھینٹ چڑھا کر اس کے صریحاً غلط اقدام کے لیے جواز فراہم کیا، انتظامیہ کو گھٹیا اغراض کے حصول کے لیے جس شرمناک طریق سے استعمال کیا گیا اور فوج کو جس ڈھٹائی کے ساتھ انتظامی اور سیاسی امور میں ملوث کیا گیا اور ملک کے اندر ان داخلی کمزوریوں کے پرورش پانے کی وجہ سے پاکستان جس انداز سے بین الاقوامی سازشوں کا اڈہ بنا۔ ان سب باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ان ہونی نہ تھی جس پر ملک میں حیرت کا اظہار کیا جاتا۔ اس قسم کے آمرانہ مزاج رکھنے والے حکمرانوں سے ان باتوں کے علاوہ اور توقع بھی کس بات کی کی جا سکتی ہے۔ اس لیے ملک کے عوام نہ تو کسی خوش فہمی کا شکار ہوئے، نہ انہیں ان باتوں پر کوئی حیرت ہوئی۔

عوام طرح طرح کی خوش فہمیوں میں اس وقت مبتلا ہوئے جب ایک فوجی آمر بڑے طمطراق کے ساتھ عوام کے ذہنوں میں نہایت ہی حسین و جمیل آرزوؤں کی جوت جگا کر اور خوش کن توقعات کے محلات دکھا کر بڑے دلفریب نعروں کے جلو میں تختِ اقتدار پر متمکن ہوا۔ اس وقت معدودے چند افراد کو چھوڑ کر ہر شخص یہی سمجھ رہا تھا کہ لو اب پاکستان کی کشتی جو مصائب کے گرداب میں پھنسی ہوئی تھی اُسے پار لگانے والا آ گیا۔ اس کے وجود سے اب ملک کے اندر خیر و برکت کے سرچشمے پھوٹیں گے، استحصال اور ناانصافی کا خاتمہ ہوگا۔ ظلم اور جبر و تشدد کو ہر صورت میں مٹا دیا جائے گا، جاگیرداروں، سرمایہ داری اور نوکر شاہی کی چیرہ دستیوں سے عوام کو نجات حاصل ہوگی اور لوگ امن اور آشتی کے ساتھ زندگی بسر کریں گے۔ مگر افسوس توقعات کے یہ خیالی پیکر قلب و نگاہ کو ابھی آسودگی بھی نہ دینے پائے تھے کہ پاکستانی کشتی کے اس کھیون ہار کے کارنامے عوام کے سامنے آنے لگے، اور انہیں یہ محسوس ہونے لگا کہ یہ ناخدا کشتی کو ساحلِ مراد پر پہنچانے کے بجائے اُسے کسی خوفناک منجدھار کی طرف لے جا رہا ہے۔

عوام کا حافظہ عام طور پر کمزور ہوتا ہے، اس لیے موجودہ حکمرانوں کی ستم رانیوں کے پیشِ نظر سابق حکمرانوں کی ریشہ دوانیوں کو اکثر بھول جاتے ہیں، لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ مسلّم ہے کہ پاکستان کی تباہی کا آغاز غلام محمد کے ہاتھوں سے ہوا، اور اس کی تکمیل کے لیے فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ اس نے سب سے پہلے فوج کو اس کے اصل فرض یعنی دفاعِ وطن سے ہٹا کر انتظامی معاملات میں براہِ راست دخیل کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک دفاعی نقطۂ نظر سے کمزور ہونے لگا اور فوج کے بارے میں عوام کے جذبات کے اندر ایسی تبدیلی آنے لگی جسے کسی طرح بھی خوش آئند نہیں کہا جا سکتا۔ عوام میں

یہ تاثر بڑی سرعت کے ساتھ پھیلنے لگا کہ فوج کو ملک میں آمریت کے تسلط کے لیے بطور آلۂ کار استعمال کیا جا رہا ہے درآنحالیکہ اس کا اصل کام ملک کو بیرونی حملہ آوروں سے بچانا ہے۔ یہ تاثر اگرچہ مغربی پاکستان میں بھی عوام کے اندر آزردگی پیدا کرنے کا باعث تھا مگر مشرقی پاکستان میں اس کی وجہ سے شدید قسم کا احساسِ محرومی پیدا ہوا اور وہاں کے باشندے یہ سمجھنے لگے کہ مغربی پاکستان کے طالع آزما فوج کے بل بوتے پر انھیں ان کے جائز حقوق سے محروم رکھ رہے ہیں، اور ان کی حیثیت پاکستان کے آزاد شہریوں کی نہیں بلکہ کسی نوآبادیاتی نظام کے اندر رہنے والے غلاموں کی سی ہے جو غیر ملکی حکمرانوں کی خاطر زندہ رہنے اور کام کرنے پر مجبور ہیں۔ اسی احساسِ محرومی نے ان کے اندر مغربی پاکستان کے خلاف جذبۂ نفرت و حقارت پیدا کیا جو بالآخر یحییٰ خان کے دورِ اقتدار میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر منتج ہوا۔

پھر یہ بھی فیلڈ مارشل صاحب اور ان کے حواریوں کے آمرانہ رجحانات کا ہی نتیجہ تھا کہ ملک کے اندر ایک جماعتی حکومت کے قیام کی راہیں ہموار ہوتی گئیں اور دھونس، دھاندلی اور تشدد کے ذریعہ برسرِ اقتدار آنے اور پھر ان فسطائی ہتھکنڈوں کی مدد سے عوام کی گردنوں پر ان کی خواہش کے علی الرغم مسلط رہنے اور دہشت اور غنڈہ گردی کے سہارے مخالفت کی آواز دبانے کا بڑے وسیع پیمانے پر کاروبار شروع ہوا۔ اور عوام کے اندر یہ خیال بڑی تیزی کے ساتھ پرورش پانے لگا کہ اس ملک میں نہ تو رائے عامہ کو ہموار کر کے کوئی تبدیلی لائی جا سکتی ہے اور نہ ووٹ کے ذریعے حکمرانوں کو بدلا جا سکتا ہے۔ اس لیے کسی فرد اور گروہ کو جو ملک کی عملی سیاست میں کچھ بھی حصہ لینا چاہتا ہے، اسے اپنا وقت اور صلاحیتیں رائے عامہ کو ہموار کرنے میں صرف کرنے کے بجائے سازش کے ذریعے مسندِ اقتدار پر قبضہ کرنے میں کھپانی چاہییں۔

دنیا کے ہر معاشرے میں فسطائیت کے جراثیم کسی نہ کسی صورت میں تھوڑے بہت پائے ہی جاتے ہیں۔ یہی حال ہمارے معاشرے کا بھی ہے۔ یہاں بھی اشتراکی عناصر اور الحاد کے علمبرداروں کے اندر یہ جراثیم موجود ہیں اور ان کی موجودگی کی وجہ بھی ظاہر ہے۔ جب کوئی چھوٹی سی اقلیت کسی ایسے نظریے کو عوام پر ٹھونسنے کے درپے ہو جو نہ تو ان کی فطرت سے مناسبت رکھتا ہو، اور نہ ان کی معاشرتی روایات سے کوئی میل کھاتا ہو، تو وہ اقلیت لازمی طور پر غیر جمہوری راستوں سے تختِ اقتدار پر متمکن ہونے کی کوشش کرتی ہے تاکہ وہ حکومت کے وسیع ذرائع کو کام میں لا کر جبر کے ذریعے اس نظریہ کا اس معاشرے میں تسلط قائم کرے۔ اس بنا پر اگر اشتراکیت اور لادینیت کے حامیوں میں فسطائیت کے جراثیم موجود ہوں تو اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں لیکن فیلڈ مارشل صاحب اور ان کے ساتھیوں نے ملکی فلاح و ترقی کے نام پر نہ صرف ان جراثیم کو ان کے محدود حلقوں کے اندر پرورش پانے کے پورے مواقع فراہم کیے بلکہ ہوسِ اقتدار کے جنون میں ان خوفناک جراثیم کو معاشرے کے رگ و پے میں بھی پھیلا دیا۔ اور لوگوں کے ذہنوں میں اس غلط اندازِ فکر کو جڑ پکڑنے کا موقع

دیا کہ پاکستان جیسے غیر ترقی یافتہ ملک کے لیے مطلق العنانی اور نیم مطلق العنانی طرزِ حکومت ہی مفید اور کارآمد ہو سکتا ہے، اور سیاسی شعور یا سیاسی تربیت پیدا ہونا موجودہ ملکی ترقی کی راہ کا سنگِ گراں ہے۔ اس طرزِ فکر کا حکومت کے ذرائع ابلاغ نے بڑی شد ومد سے پرچار کیا اور ملک کے اندر اور باہر اسلام دشمن طاقتوں نے فیلڈ مارشل صاحب کے سایہ عاطفت کو غنیمت جانتے ہوئے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا اور غیر اسلامی افکار و تصورات کو وہ جس حد تک پھیلا سکتے تھے انہیں پھیلانے کی کوشش کی۔

اس قسم کے غیر دانشمندانہ اقدامات کا جو نتیجہ برآمد ہونا تھا وہ بالآخر ہوا۔ چنانچہ اس خطہ پاک میں ایک طرف تو سیاسی شعبدہ بازوں کو اپنے کرتب دکھانے کے لیے کھلا میدان ہاتھ آ گیا۔ دوسری طرف انتظامیہ نے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنے کے بجائے اپنی ساری قوتیں حکمران طبقہ کی خوشنودی کے حصول کے لیے صرف کرنا شروع کر دیں اور ملک میں امن و امان کی صورت غارت ہو کر رہ گئی۔ ان حالات میں سماج دشمن عناصر کو کھل کھیلنے کے بھرپور مواقع حاصل ہو گئے اور دیکھتے دیکھتے یہ ملک عوام کی مقدس آرزوؤں اور تمناؤں کی تکمیل کا مرکز بننے کے بجائے ان کا مدفن بننے لگا اور زندگی اپنی ساری وسعتوں کے باوجود اُن کے لیے اس حد تک تنگ ہو گئی کہ اُن کے لیے جسم اور روح کے رشتے کو برقرار رکھنا محال ہو گیا۔ لوگ فیلڈ مارشل صاحب کے بارے میں جن خوش فہمیوں میں مبتلا تھے اُن کی اصل حقیقت کھُل کر سامنے آنے لگی اور خوش کُن توقعات کے جو محلات انہوں نے تعمیر کر رکھے تھے وہ ریت کے گھروندوں کی طرح پیوندِ خاک ہونے لگے اور ہر شخص اپنی جگہ اس تلخ حقیقت کو پوری شدت سے محسوس کرنے لگا کہ اُسے فوجی انقلاب کی "برکات" کا صحیح اندازہ لگانے میں سخت غلطی لگی ہے اور اس انقلاب سے اس مُلک اور اس کے عوام کو خاصا نقصان پہنچا ہے اور قوم فلاح و کامرانی کے اعتبار سے کم از کم پچاس سال پیچھے جا پڑی ہے۔ مگر قربان جائیے ان چابکدست حکمرانوں کے کہ وہ ان "تلخ حقائق" کے کھُل کر سامنے آ جانے کے باوجود قوم کی گاڑھے پسینے کی کمائی اسے یہ باور کرانے میں بے محابا صرف کر رہے تھے کہ مُلک تو ہر لحاظ سے محیّر العقول ترقی کر رہا ہے۔ البتہ ملک کے بدخواہ اس کا اعتراف کرنے میں بُخل سے کام لے رہے ہیں اور وہ فیلڈ مارشل صاحب کے عظیم الشان کارناموں کو قدر کی نگاہ سے دیکھنے کے بجائے ان میں کیڑے نکال رہے ہیں۔ ان لوگوں کو قوم کی خوشحالی ایک آنکھ نہیں بھاتی اور قوم کا بڑھتا ہوا وقار اور ملکی استحکام ان پر شاق گزرتا ہے۔ لہٰذا یہ ملک اور قوم کے بدخواہ ہیں اور عوام کو ان کی باتوں پر کبھی کان نہ دھرنے چاہئیں۔ صدر محمد ایوب صاحب کے ان عظیم کارناموں کو روشناس کرانے کے لیے یُوں تو ریڈیو اور ٹیلیویژن اور سرکاری اخبارات ہمہ تن مصروف رہتے تھے لیکن سال میں کئی مرتبہ مختلف مقامات پر زرِ کثیر صرف کر کے ایسی تقریبات منعقد کی جاتیں جن میں ان کا خوب پرچار کیا جاتا۔

"دس سالہ دورِ ترقی کا جشن" بھی حکومت کے وسیع پراپیگنڈے کی ہی ایک کڑی تھا۔

عوام کو تو ہر لحظہ ملک کی خوشحالی کا مژدۂ جانفزا سنایا جاتا اور انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی کہ قوم بڑی سرعت کے ساتھ ترقی کی منازل طے کر رہی ہے لیکن قوم کے عام افراد کے لیے زندگی عذاب بنتی جا رہی تھی۔ عوام میں پہلے ہی کے اندر اس پراپیگنڈے کے خلاف شدید ردِعمل پیدا ہوا اور انہوں نے ترقی کے ان نعروں اور بیانات کو حکومت کی فریب کاری پر محمول کیا اور اس کا جو نتیجہ برآمد ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔

فیلڈ مارشل صاحب کے بعد جس شخص کے ہاتھ میں ملک کی زمامِ کار آئی اس کے بارے میں عوام کسی خوش فہمی میں گرفتار نہ تھے۔ لوگ جانتے تھے کہ ایک بگڑا ہوا سینئر فوجی افسر محض اپنی اونچی پوزیشن کی وجہ سے اقتدار پر متمکن ہو گیا ہے۔ اس میں نہ تو ملک کو سنبھالنے کی کوئی صلاحیت ہے اور نہ قوم کو راہِ ترقی پر گامزن کرنے کی کوئی بصیرت اور جذبہ۔ اس شخص کی ذاتی زندگی کی رنگین داستانیں زبان زدِ عام تھیں اور کوئی فرد بھی اس سے خیر اور بھلائی کا متوقع نہ تھا۔ ہم واضح طور پر ایک بات کہ یہ شخص چونکہ پورے ملک کی حکومت کا بوجھ اٹھانے کی اہلیت اور حوصلہ نہیں رکھتا، اس لیے شاید یہ جلد ہی اس بوجھ کو دوسرے کے کندھوں پر منتقل کرنے کا کوئی انتظام کرے اور خود عافیت کے ساتھ ایک کونے میں ہٹ کر بیٹھ جائے۔ چنانچہ اس شخص نے ملک میں عام انتخابات تو کروائے مگر وہ ان تخریب پسند قوتوں کی راہ روکنے میں یکسر ناکام رہا جو اس ملک کے حصے بخرے کرنے پر ادھار کھائے بیٹھی تھیں۔ نتیجۃً اس جرنیل کی نااہلی کی وجہ سے پاکستان کا ایک مضبوط بازو کٹ کر ہندو سامراج کے قبضے میں چلا گیا۔

جنرل یحییٰ خان کے بعد اب اس ملک کی عنانِ اقتدار پھر ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں آئی ہے جو عوام کے سامنے بڑے دلفریب نعروں کے ساتھ اچانک نمودار ہوا، اور جس نے انہیں بڑی غلط امیدیں دلا کر ان سے ووٹ حاصل کیے۔ عوام نے اسے قوم کا واحد نجات دہندہ سمجھ کر اس کی طرف والہانہ انداز سے رجوع کیا اور یہ صاحب بچشمِ زدن میں قائدِ عوام اور فخرِ ایشیا اور اہلِ پاکستان کی آرزوؤں کے مرکز و محور کی حیثیت سے مسندِ اقتدار پر براجمان ہو گئے۔ اس شخص کو ان بلند مراتب پر فائز کرتے وقت اور اس کے خوش کن انقلابی منصوبوں، ملک، صلاحِ احوال کے لیے شاعرانہ نوعیت کے پروگراموں پر یقین کرتے وقت عوام نے یہ سوچنے کی زحمت تک بھی گوارا نہ کی کہ ذرا اپنے اس محبوب قائد کے درخشاں ماضی، شاہانہ مزاج، آمرانہ اندازِ فکر اور خود پسندانہ طرزِ عمل پر بھی غور کر لیا جائے کیونکہ ان چیزوں پر پوری طرح نگاہ رکھے بغیر کسی فرد کو ٹھیک طور پر سمجھا نہیں جا سکتا۔ جو شخص چند ماہ پیشتر آمریت کا زبردست مؤید اور حامی رہا ہو، اور اسے ملک میں مستحکم کرنے کے

لیے پوری طرح تنگ و دو بھی کرتا رہا ہو وہ اچانک فکر و نظر کی تبدیلی کے بغیر جمہوریت کا علمبردار کس طرح بن سکتا ہے؟ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہونے والے اور عیش و عشرت میں پل کر جوان ہونے والے افراد غربت و افلاس کی سنگینیوں کو کس طرح محسوس کر سکتے ہیں؟ کوٹھیوں اور محلات میں زندگی بسر کرنے والے لوگ جھونپڑوں میں رہنے والے لوگوں کے مسائل کا آخر کہاں تک ادراک کر سکتے ہیں۔ خصوصاً ان حالات میں جب کہ سوائے انتخابات کے سر پر کھڑے ہو جانے کے نہ تو تبدیلی کے کوئی محرکات موجود ہوں اور نہ قلبِ ماہیت کے کوئی واضح آثار نظر آتے ہوں۔ قوم پر چونکہ وابستگی کا عالم طاری تھا اس لیے اس نے ان حقائق کی طرف قطعاً کوئی توجہ نہ دی اور اپنے آپ کو اس خوش فہمی میں مبتلا رکھنے پر مصر رہی کہ اس قسم کے اندیشے دوسروں کے بارے میں صحیح ہو سکتے ہیں۔ لیکن اب جو قائد انہیں میسر آیا ہے اس کے بارے میں اس انداز پر سوچنا اور غور کرنا بالکل غلط ہے۔ یہ صاحب مستقبل قریب میں اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیں گے کہ ان کی ذاتِ گرامی کے بارے میں اس قسم کے خدشات کا اظہار بالکل بے بنیاد تھا۔

عوام کا قریب قریب یہی ناپختہ اندازِ فکر اس نجات دہندہ کے انقلابی پروگراموں کے بارے میں بھی تھا۔ وہ اس بات کا یقین رکھتے تھے کہ اس کے عہدِ اقتدار میں ملک سے غربت اور افلاس کا خاتمہ ہو گا۔ بندۂ مزدور کے اوقات کی تلخی دور ہو گی اور اسے حقیقی آرام اور سکون میسر آئے گا۔ بیروزگاری کا قلع قمع ہو گا۔ ملک میں ایک ایسا نظامِ تعلیم پروان چڑھے گا جو ہماری ملی آرزوؤں سے ہم آہنگ ہو گا۔ ملک کے اندر جو غیر ملکی سازشیں پرورش پا رہی ہیں ان کے سدِ باب کی فکر کی جائے گی۔ سابق حکمران اپنی برتری کا جھوٹا نقش عوام کے ذہنوں پر مرتسم کرنے کے لیے ملک کی دولت جس طرح اڑاتے رہے ہیں اس کا محاسبہ کیا جائے گا اور آئندہ قوم کے اندر کسی فرد کی شخصیت کا طلسم قائم کرنے کے بجائے پاکستان کے اساسی نظریات کو عوام کے ذہنوں اور خصوصاً نوجوان طبقہ کے دل و دماغ میں بٹھانے کی کوشش کی جائے گی۔ لیکن ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

عوام کے اندر موجودہ حالات کے بارے میں جو شدید کرب و اضطراب پایا جاتا ہے اور ان حالات کی پرچھائیں میں انہیں ملک و ملت کا مستقبل جس طرح تاریک نظر آ رہا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ ہر شخص جو تھوڑی بہت سمجھ بوجھ بھی رکھتا ہے وہ اپنے آپ کو ہر لحاظ سے سخت پریشانی میں مبتلا پاتا ہے۔ لیکن داد دیجیے حکمرانوں کی ڈھٹائی کی کہ اب جب کہ قوم کے سامنے سارے تلخ حقائق کھل کر آ گئے ہیں، اور زندگی عذاب کی صورت میں اس پر پوری طرح مسلط ہو چکی (باقی برصفحہ ۴۴)

آغاز رسالت اور خفیہ دعوت کے ابتدائی تین سال

(۲)

نزول وحی کی ابتدا کب ہوئی؟ یہ اوّلین وحی جو سورۂ علق کی پہلی پانچ آیتوں پر مشتمل ہے، کب نازل ہوئی؟ اس کے بارے میں اہلِ روایت کے مختلف اقوال ہیں۔ ابن عبدالبرؒ اور مسعودی نے کہا ہے کہ حضورؐ کی بعثت ۸ ربیع الاول ۴۱ عام الفیل کو ہوئی، اور ابن القیمؒ نے زاد المعاد میں اس کو قول الاکثرین کہا ہے، لیکن جن لوگوں کا یہ قول ہے انہوں نے غالباً بعثت کی ابتدا اُس وقت سے قرار دی ہے جب آپؐ کو بروایت بیہقی نزولِ وحی سے ۶ مہینے پہلے سچے خواب نظر آنے شروع ہوئے تھے۔ رہا نزولِ وحی تو اس باب میں قرآن مجید کا بیان صاف ہے کہ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ (البقرہ۔ ۱۸۵) "رمضان کا مہینہ جس میں قرآن نازل کیا گیا" اس صریح نصِ قرآنی کے خلاف ظاہر ہے کہ کوئی دوسرا قول معتبر نہیں ہو سکتا۔

اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رمضان کی وہ کون سی تاریخ تھی جب نزولِ قرآن کا یہ سلسلہ شروع ہوا۔ اس باب میں مختلف اقوال ہیں۔ بعض لوگ ۷ رمضان بتاتے ہیں۔ ابن سعد نے ایک جگہ ۱۲، اور دوسری جگہ امام محمد الباقرؒ کے حوالہ سے ۱۰ رمضان تاریخ لکھی ہے۔ طبری و ابن اثیر نے ابو قلابۃ الجرمی کے حوالہ سے ۱۸ رمضان، اور بعض اور لوگوں نے ۱۹ رمضان تاریخ بیان کی ہے۔ واثلہؓ بن الاسقع، جابرؓ بن عبداللہ اور ابو الجلد کی روایت ۲۴ رمضان کی ہے۔ لیکن قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ "ہم نے اس (قرآن) کو شبِ قدر میں نازل کیا ہے"۔ اور علمائے امت کی بڑی اکثریت یہ رائے رکھتی ہے کہ رمضان کی آخری دس راتوں میں سے کوئی ایک طاق رات شبِ قدر ہے، بلکہ ان میں بھی زیادہ تر لوگ ستائیسویں رات کو شبِ قدر کہتے ہیں۔ (اضافہ از مؤلف)

اس معاملہ میں جو معتبر احادیث منقول ہوئی ہیں انہیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لیلۃ القدر کے بارے میں فرمایا وہ ستائیسویں یا انتیسویں رات ہے (ابوداؤد طیالسی)۔ دوسری روایت حضرت ابو ہریرہؓ سے یہ ہے کہ وہ رمضان کی آخری رات ہے (مسند احمد)

حضرت اُبَی بن کعب سے زِرّ بن حُبَیش نے شب قدر کے متعلق پوچھا تو انہوں نے حلفاً کہا اور استثنا نہ کیا کہ وہ ستائیسویں رات ہے (احمد، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن حبان)۔

حضرت ابوذرؓ سے اس کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ حضرت عمرؓ، حضرت حذیفہؓ اور اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے بہت سے لوگوں کو اس میں کوئی شک نہ تھا کہ وہ رمضان کی ستائیسویں رات ہے (ابن ابی شیبہ)

حضرت عبادہؓ بن صامت کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شب قدر رمضان کی آخری دس راتوں میں سے طاق رات ہے، اکیسویں، یا تئیسویں، یا پچیسویں، یا ستائیسویں، یا انتیسویں، یا آخری (مسند احمد)

حضرت عبداللہؓ بن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اسے رمضان کی آخری دس راتوں میں تلاش کرو، جب مہینہ ختم ہونے میں ۹ دن باقی ہوں، یا سات دن باقی، یا پانچ دن باقی (بخاری)۔ اکثر اہل علم نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ حضورؐ کی مراد طاق راتوں سے تھی۔

حضرت ابوبکرؓ کی روایت ہے کہ ۹ دن باقی ہوں، یا سات دن، یا پانچ دن، یا تین دن، یا آخری رات۔ مراد یہ تھی کہ ان تاریخوں میں لیلۃ القدر کو تلاش کرو (ترمذی، نسائی)۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ وسلم نے فرمایا کہ شب قدر کو رمضان کی آخری دس راتوں میں سے طاق رات میں تلاش کرو (بخاری، مسلم، احمد، ترمذی)۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت عبداللہؓ بن عمر کی یہ بھی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تازیست رمضان کی آخری دس راتوں میں اعتکاف فرمایا ہے۔

اس معاملہ میں جو روایات حضرت معاویہؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابنؓ عباس وغیرہ بزرگوں سے مروی ہیں ان کی بنا پر علمائے سلف کی بڑی تعداد ستائیسویں رمضان ہی کو شب قدر سمجھتی ہے (تفہیم القرآن، جلد ششم، القدر، حاشیہ ۱)

نبوت کے بعد پہلا فرض، نماز طبری نے لکھا ہے کہ سب سے پہلی چیز جو اقرارِ توحید اور بتوں سے برأت کے بعد شرائع اسلام میں سے فرض کی گئی وہ نماز تھی۔ سُہَیلی نے ابن لَہیعہ کی روایت حضرت زیدؓ بن حارثہ سے نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی مرتبہ وحی نازل ہونے کے بعد جبرئیلؑ آپ کے پاس آئے اور انہوں نے آپ کو وضو کی تعلیم دی۔ ابن ماجہ نے بھی اس حدیث کو نقل کیا ہے اور اس کی تشریح ابن اسحٰق کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ حضورؐ مکہ کے بالائی حصہ میں تھے۔ جبریل بہترین صورت اور بہترین خوشبو کے ساتھ آپ کے سامنے ظاہر ہوئے اور انہوں نے کہا کہ اے محمدؐ، اللہ نے آپ کو سلام کہا ہے اور فرمایا ہے کہ آپ جن وانس کی طرف میرے رسول ہیں اس لیے آپ قولِ لاالٰہ الا اللہ کی طرف اُن کو دعوت دیں۔ پھر انہوں نے زمین پر پاؤں مارا جس سے پانی کا ایک چشمہ اُبل پڑا اور انہوں نے وضو کیا تاکہ

آپ نماز کے لیے پاک ہونے کا طریقہ سیکھ لیں۔ پھر آپ سے کہا کہ اب آپ وضو کریں۔ پھر جبرئیل نے حضور کے ساتھ دو رکعتیں چار سجدوں کے ساتھ پڑھیں۔ اس کے بعد حضور حضرت خدیجہؓ کو وہاں لائے اور وضو کرایا اور دو رکعتیں ان کے ساتھ پڑھیں۔ ابن ہشام، ابن جریر اور ابن کثیر نے بھی اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔

امام احمد، ابن ماجہ اور طبرانی (فی الاوسط) وغیرہم نے اُسامہؓ بن زید سے اور انہوں نے اپنے والد حضرت زیدؓ بن حارثہ سے نقل کیا ہے کہ حضور پر وحی آنے کے بعد پہلا کام یہ ہوا کہ جبرئیل نے آکر آپ کو وضو کا طریقہ بتایا، پھر جبرئیل نماز کے لیے کھڑے ہوئے اور آپ سے کہا کہ آپ اُن کے ساتھ نماز پڑھیں۔ پھر حضور گھر تشریف لائے اور حضرت خدیجہؓ سے اس کا ذکر کیا۔ وہ خوشی کے مارے مدہوش ہو گئیں۔ پھر حضورؐ نے ان کو اسی طرح وضو کرنے کے لیے کہا اور ان کو ساتھ لے کر اسی طرح نماز پڑھی جس طرح آپ نے جبرئیل کے ساتھ پڑھی تھی۔ پس یہ پہلا فرض تھا جو نزولِ اِقرأ کے بعد مقرر کیا گیا۔ اغلب یہ ہے کہ یہ اُسی رات کی صبح کا واقعہ ہے جس رات اِقرأ نازل ہوئی۔ اس کے بعد حضورؐ اور حضرت خدیجہؓ خفیہ طریقہ سے نماز پڑھتے رہے۔

پہلے چار مسلمان یہ بات متفق علیہ ہے کہ سب سے پہلی مسلمان حضرت خدیجہؓ تھیں۔ اس کے بعد اس امر میں اختلاف ہے کہ حضرت علیؓ، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت زیدؓ بن حارثہ میں سے کون سب سے پہلے اسلام لایا۔ بہرحال یہ بالاتفاق تسلیم کیا جاتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کے بعد اوّلین اسلام لانے والے یہی تین حضرات تھے۔

حضرت علیؓ کے متعلق حافظ ابن کثیر نے البدایہ میں ابن اسحٰق کی روایت نقل کی ہے کہ جب حضورؐ اور حضرت خدیجہؓ نے خفیہ طریقے سے نماز پڑھنی شروع کی تو اس کے ایک دن بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو حالتِ نماز میں دیکھ لیا۔ پوچھا یہ کیا ہے؟ حضور نے فرمایا "یہ اللہ کا دین ہے جس کو اس نے اپنے لیے پسند فرمایا ہے اور جس کے ساتھ اس نے اپنے رسول بھیجے ہیں۔ لہٰذا میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ اللہ وحدہٗ لاشریک کو مانو اور اس کی عبادت کرو اور لات و عزّیٰ کا انکار کر دو"۔ حضرت علی جو اُس وقت دس سال کے تھے، انہوں نے عرض کیا کہ یہ ایسی بات ہے جو آج سے پہلے میں نے کبھی نہ سُنی تھی، میں فیصلہ نہیں کر سکتا جب تک اپنے والد سے نہ پوچھ لوں۔ حضور اُس وقت یہ نہ چاہتے تھے کہ آپ کا راز قبل از وقت ظاہر ہو جائے، اس لیے آپ نے فرمایا اگر تم قبول نہیں کرتے تو اس بات کو مخفی رکھو۔ اُس رات حضرت علیؓ نے توقف کیا۔ پھر اللہ نے ان کے دل میں اسلام ڈال دیا اور صبح انہوں نے حاضر ہو کر پوچھا کہ کل آپ نے میرے سامنے کیا بات پیش فرمائی تھی؟ حضور نے فرمایا یہ کہ "تم گواہی دو کہ اللہ وحدہٗ لاشریک کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور لات و عزّیٰ کا انکار کرو، اور اللہ کے سوا دوسرے شریکوں سے قطع تعلق کرو"۔ حضرت علیؓ نے فوراً اسے قبول کر لیا، لیکن ابوطالب کے خوف سے اپنا اسلام مخفی رکھا۔ البتہ وہ بھی حضور کے ساتھ نماز پڑھنے لگے۔

ابن جریر طبری اور ابن عبدالبر نے عفیف کندیؓ (اشعثؓ بن قیس کے ماں جائے اور چچازاد بھائی) کا بیان نقل کیا ہے کہ عباسؓ بن عبدالمطلب میرے پرانے دوست تھے اور اکثر یمن آکر عطر خریدتے اور حج کے زمانے میں فروخت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایام حج میں جب میں اُن سے منیٰ میں ملا تو میں نے دیکھا کہ ایک مرد معقول آیا اور اس نے خوب اچھی طرح وضو کیا، پھر وہ نماز پڑھنے کھڑا ہو گیا۔ اس کے بعد ایک عورت آئی اور اس نے بھی وضو کیا اور نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی۔ پھر ایک لڑکا جو ابھی بلوغ کی عمر سے کم تھا آیا اور اس نے بھی وضو کیا اور پہلے شخص کے پہلو میں نماز پڑھنے کھڑا ہو گیا۔ میں نے کہا اے عباس یہ کیا دین ہے، اسے تو میں نہیں جانتا۔ عباس نے کہا "یہ میرے بھائی کے بیٹے محمدؐ بن عبداللہ بن عبدالمطلب ہیں، ان کا دعویٰ ہے کہ اللہ نے ان کو رسول بنا کر بھیجا ہے (اور ایک روایت یہ بھی ہے کہ ان کا دعویٰ ہے کہ قیصر و کسریٰ کے خزانے ان کے لیے فتح ہو جائیں گے)۔ اور یہ دوسرا میرا بھتیجا علیؓ بن ابی طالب ہے جس نے ان کے دین میں ان کی پیروی اختیار کی ہے۔ اور یہ ان کی بیوی خدیجہؓ بنت خُوَیلد ہیں اور انہوں نے بھی ان کے دین میں ان کی پیروی کی ہے۔" بعد میں جب عفیف کندیؓ خود مسلمان ہوئے تو وہ حسرت کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ کاش اُس وقت میں اُن میں کا چوتھا ہوتا۔

ابن ہشام اور ابن جریر نے لکھا ہے کہ بعد میں کسی وقت ابوطالب نے بھی حضرت علیؓ کو نماز پڑھتے دیکھ لیا۔ پوچھا بیٹا یہ کیا دین ہے جس پر تو چل رہا ہے؟ انہوں نے کہا "ابا جان میں اللہ اور اس کے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لایا ہوں اور ان کی تصدیق کی ہے اور ان کے ساتھ نماز پڑھی ہے"۔ ابوطالب نے کہا "وہ تمہیں بھلائی کے سوا کبھی کسی چیز کی طرف دعوت نہ دیں گے۔ تم ان کے ساتھ لگے رہو"۔ ابن کثیر نے ابوطالب کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں "اپنے چچا زاد بھائی کا ساتھ دو اور ان کی مدد کرو"

حضرت ابوبکرؓ کے متعلق زُرقانی نے شرحِ مواہب میں لکھا ہے کہ وہ حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے حکیم بن حزام کے ہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں حضرت حکیم کی لونڈی ان کے پاس آئی اور اس نے کہا کہ آپ کی پھوپھی آج کہہ رہی تھیں کہ ان کے شوہر حضرت موسیٰؑ کی طرح نبی ہیں جنہیں اللہ نے بھیجا ہے۔ یہ سنتے ہی حضرت ابوبکرؓ سیدھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے اور یہ معلوم کرتے ہی کہ اس لونڈی کا بیان صحیح تھا، بلا تامل ایمان لے آئے۔ ابن اسحٰق نے عبداللہ بن الحُصَین التمیمی سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے جس کے سامنے بھی اسلام پیش کیا اس نے کچھ نہ کچھ تردد کیا اور سوچا، مگر ابوبکرؓ سے جونہی میں نے اس کا ذکر کیا انہوں نے کوئی تردد نہ کیا اور تسلیم کرنے میں ذرا سی دیر بھی نہیں لگائی۔

حضرت زیدؓ بن حارثہ کے متعلق کوئی تفصیل مذکور نہیں ہے کہ وہ کیسے ایمان لائے۔ مگر ۱۵ سال سے وہ حضور کے ساتھ آپ کے گھر کے ایک فرد کی طرح رہتے تھے۔ ضرور ہے کہ حضورؐ اور حضرت خدیجہؓ کو انہوں نے بھی نماز پڑھتے دیکھا ہوگا اور یہی ان کے اسلام لانے کا سبب بنا ہوگا۔

اِن واقعات سے ضمناً یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اگرچہ حضور ابتدا میں پوشیدہ طریقہ سے کام کر رہے تھے، لیکن آپ کے اور حضرت خدیجہؓ کے قریبی رشتہ دار سب کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ آپ دینِ آبائی کے خلاف ایک دوسرا دین پیش کر رہے ہیں، اللہ کی طرف سے نبی مقرر ہونے کا دعوٰے کر رہے ہیں، اور آپ کے اس دعوے کو نہ صرف یہ کہ آپ کے اہلِ خانہ اور کم از کم ایک دوست نے مان لیا ہے، بلکہ اس کے مطابق عبادت بھی دوسرے طریقے پر شروع کر دی ہے۔ تاہم چونکہ یہ علم دشمنوں کو نہیں بلکہ آپ کے خیر خواہوں اور آپ سے گہری محبت و ہمدردی رکھنے والوں کو ہوا تھا، اس لیے انہوں نے اُس پردے کو پڑا رہنے دیا جو آغاز میں حضورؐ ڈالے رکھنا چاہتے تھے، اور اس بات کا کوئی چرچا نہ کیا کہ قبل از وقت مخالفت شروع ہو جاتی۔

کیا ابتدائی تین سالوں میں حضرت اسرافیلؑ آپؐ کی تعلیم کے لیے مقرر کیے گئے تھے؟

ابن جریر نے اپنی تاریخ میں، اور ابن سعد نے طبقات، اور قسطلانی نے مَوَاہِبُ اللّدُنّیّہ، اور زُرقانی نے شرحِ مواہب میں مشہور تابعی امام شعبی کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ نبوت کے بعد ابتدائی تین سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت اسرافیلؑ کو تعلیم کے لیے لگا دیا گیا تھا۔ وہ وحی نہیں لاتے تھے کیونکہ وحی لانا صرف جبریل علیہ السلام کا کام تھا، البتہ وہ کسی اور طریقہ سے حضور کو علوم کی تعلیم دیتے تھے"۔ ممکن ہے کہ یہ طریقہ خواب ہو، یا دل میں القاء ہو، یا بالمشافہہ تلقین ہو۔

امام احمد بن حنبل اور یعقوب بن سُفیان الحافظ اور بیہقی نے بھی امام شعبی کی اس روایت کو نقل کیا ہے، اور اُن تک اس کی سند صحیح ہے۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہے کہ خود شعبی کو یہ خبر کس ذریعہ سے پہنچی، کیونکہ انہوں نے حضورؐ تک اس کی سند بیان نہیں کی ہے۔ ابن سعد اور ابن جریر نے لکھا ہے کہ واقدی نے اس کی صحت سے قطعی انکار کیا ہے اور حتمی طور پر یہ کہا ہے کہ حضور کے ساتھ جبریلؑ کے سوا کوئی دوسرا فرشتہ نہیں لگایا گیا۔

یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کا نہ قطعی انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ قطعی اقرار۔ انکار اس لیے مشکل ہے کہ شعبی ایک ثقہ محدث ہیں اور ان کی مُرسَل روایت بھی ایسی کمزور نہیں ہو سکتی کہ اسے بالکل رد کر دیا جائے۔ لیکن اس کو ایک یقینی واقعہ بھی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ روایت اپنی سند کے لحاظ سے ایسی مضبوط بھی نہیں ہے کہ اسے ضرور تسلیم ہی کر لیا جائے۔ تاہم یہ امر بعید از امکان نہیں ہے کہ نبوت کے بعد حضور کے اقوال اور اعمال میں زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق

علم و دانش کا جو ہمہ گیر خزانہ ہمیں ملتا ہے، جس سے حدیث و سیرت کی کتابیں بھری پڑی ہیں، اور جس کی کوئی نظیر کسی دوسرے انسان کے اقوال و اعمال میں کسی ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ میں بھی نہیں ملتی، وہ ضرور غیب سے آپ پر القا ہوتے ہوں گے، اور کیا عجب کہ اس خزانے کو آپ کے سینے میں بھر دینے کی خدمت اللہ تعالیٰ نے حضرت اسرافیل علیہ السلام سے لی ہو۔

فترۃ الوحی پہلی وحی نازل ہونے کے بعد ایک مدت تک جبریل علیہ السلام کوئی وحی نہ لائے اور اس پر آپ کا رنج و غم اُتنا ہی بڑھتا چلا گیا جتنی یہ مدت طویل ہوتی گئی، حتیٰ کہ آپ بیخودی کے عالم میں کبھی ثبیر و مکہ کے ایک پہاڑ، اور کبھی حراء پر جا کر ارادہ فرماتے تھے کہ اپنے آپ کو نیچے گرا دیں۔ اس حالت میں جب کہ آپ کسی پہاڑ کے کنارے کا رُخ کر رہے تھے، آپ نے آسمان سے ایک آواز سُنی اور آپ ٹھہر گئے۔ نظر اُٹھا کر دیکھا تو جبریل آسمان و زمین کے درمیان کرسی پر بیٹھے نظر آئے اور انہوں نے کہا کہ "اے محمدؐ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں اور میں جبریل ہوں"۔ ابن سعد نے اس کا قصہ حضرت عبداللہؓ بن عباس سے اور ابن جریر نے تفسیر میں امام زہری سے نقل کیا ہے۔ بخاری و مسلم اور مسند احمد میں بھی اس کی تفصیلات مذکور ہیں۔ (اضافہ از مؤلف)

امام زہری کی روایت یہ ہے:

"ایک مدت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول بند رہا اور اس زمانے میں آپ پر اس قدر شدید غم کی کیفیت طاری رہی کہ بعض اوقات آپ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھ کر اپنے آپ کو گرا دینے کے لیے آمادہ ہو جاتے تھے۔ لیکن جب کبھی آپ کسی چوٹی کے کنارے پر پہنچتے جبریل علیہ السلام نمودار ہو کر آپ سے کہتے کہ آپ اللہ کے نبی ہیں، اس سے آپ کے دل کو سکون ہو جاتا تھا، اور وہ اضطراب کی کیفیت دُور ہو جاتی تھی"۔ (ابن جریر)

اس کے بعد امام زہری حضرت جابرؓ بن عبداللہ کی یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فترۃ الوحی (وحی بند رہنے کے زمانے) کا ذکر کرتے ہوئے بیان فرمایا "ایک روز میں راستے سے گزر رہا تھا، یکایک میں نے آسمان سے ایک آواز سُنی۔ سر اٹھایا تو دیکھا کہ وہی فرشتہ جو غارِ حراء میں میرے پاس آیا تھا، آسمان اور زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ میں یہ دیکھ کر سخت دہشت زدہ ہو گیا، اور گھر پہنچ کر میں نے کہا مجھے اُڑھاؤ، مجھے اُڑھاؤ۔ چنانچہ گھر والوں نے مجھ پر لحاف (یا کمبل) اُڑھا دیا۔ اس وقت اللہ نے وحی نازل کی یَاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ۔ پھر لگاتار مجھ پر وحی کا نزول شروع ہو گیا"۔ (بخاری۔ مسلم۔ مسند احمد۔ ابن جریر)

(تفہیم القرآن جلد ششم، دیباچہ سورۃ المدثر)

سورۂ مُدَّثِّر کی ابتدائی سات آیات کا نزول

اس طرح فترۃ الوحی کا زمانہ ختم ہوا اور سورۂ مدثر کی ابتدائی سات آیات نازل ہوئیں جن میں حضورؐ کو منصبِ رسالت پر مامور کر کے وہ ضروری ہدایات دی گئیں جو اس منصب کے فرائض ادا کرنے کے لیے درکار تھیں۔ یہاں اِس فرق کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ سورۂ عَلَق کی پہلی پانچ آیات صرف یہ ظاہر کرتی تھیں کہ آپ پر نزولِ وحی کا آغاز ہو گیا ہے اور آپ اللہ تعالےٰ کی طرف سے نبی بنا دیے گئے ہیں۔ اب سورۂ مدثر کی اِن آیات میں آپ کو نبوت کے ساتھ ساتھ فریضۂ رسالت بھی سونپ دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ آپ اُٹھ کر اس فرض کو ادا کرنا شروع کر دیں۔ اِن آیات کے متعلق بعض روایات میں تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ یہی قرآن مجید کی اوّلین آیات ہیں۔ چنانچہ بخاری، مسلم، ترمذی، اور مُسند احمد وغیرہ میں حضرت جابر بن عبداللہؓ انصاری سے اس کی صراحت منقول ہوئی ہے۔ لیکن امت میں یہ بات قریب قریب بالاتفاق مسلّم ہے کہ سب سے پہلے اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ سے مَا لَمْ یَعْلَمْ تک پانچ آیات نازل ہوئی تھیں۔ اس کے بعد بقولِ ابنِ اثیر، زمانۂ فترۃ (وحی بند رہنے کا زمانہ) سورۂ مدّثر کی ان آیات کے نزول تک رہا۔ پھر اس کے بعد وحی کا سلسلہ از سرِ نو شروع ہو گیا۔ خود حضرت جابرؓ بن عبداللہ انصاری سے امام زُہری نے یہ بات نقل کی ہے کہ ان آیات کے نزول سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسی فرشتے کو آسمان و زمین کے درمیان کرسی پر بیٹھے دیکھا تھا جو حرا میں آپ کے پاس آیا تھا۔ یہ روایت ہم اوپر بخاری و مسلم وغیرہ کے حوالہ سے درج کر چکے ہیں۔ (اضافہ از مؤلف)

اب سورۂ مدثر کی ان آیات کو ملاحظہ کیجیے اور دیکھیے کہ ان میں کیا ہدایات دی گئی تھیں:

یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ — اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے

(آیت ۱)

اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یا ایھا الرسول یا یا ایھا النبی کہہ کر مخاطب کرنے کے بجائے یا ایھا المدثر کہہ کر کیوں مخاطب کیا گیا ہے؟ چونکہ حضور یکایک جبریل علیہ السلام کو آسمان و زمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھے دیکھ کر ہیبت زدہ ہو گئے تھے اور اسی حالت میں گھر پہنچ کر آپ نے اپنے اہلِ خانہ سے فرمایا تھا کہ مجھے اڑھاؤ، مجھے اڑھاؤ، اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کو یا ایھا المدثر کہہ کر خطاب فرمایا۔ اس لطیف طرزِ خطاب سے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اے میرے پیارے بندے، تم اوڑھ لپیٹ کر لیٹ کہاں گئے، تم پر تو ایک کارِ عظیم کا بار ڈالا گیا ہے جسے انجام دینے کے لیے تمہیں پورے عزم کے ساتھ اُٹھ

کھڑا ہونا چاہیے۔

قُمْ فَاَنْذِرْ اٹھو اور خبردار کرو

(آیت ۲)

یہ اُسی نوعیت کا حکم ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کو نبوت کے منصب پر مامور کرتے ہوئے دیا گیا تھا کہ اَنْذِرْ قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ "اپنی قوم کے لوگوں کو ڈراؤ قبل اس کے کہ ان پر ایک دردناک عذاب آجائے" (نوح-۱)۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے، اٹھو اور تمہارے گرد وپیش خدا کے جو بندے خوابِ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں ان کو چونکا دو۔ انہیں اُس انجام سے ڈراؤ جس سے یقیناً وہ دوچار ہوں گے اگر اسی حالت میں مبتلا رہے۔ انہیں خبردار کردو کہ وہ کسی اندھیر نگری میں نہیں رہتے ہیں جس میں وہ اپنی مرضی سے جو کچھ چاہیں کرتے رہیں اور ان کے کسی عمل کی کوئی باز پرس نہ ہو۔

وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو۔

(آیت ۳)

یہ ایک نبی کا اولین کام ہے جسے اس دُنیا میں اسے انجام دینا ہوتا ہے۔ اُس کا پہلا کام ہی یہ ہے کہ جاہل انسان یہاں جن جن کی بڑائی مان رہے ہیں ان سب کی نفی کردے اور ہانکے پکارے دنیا بھر میں یہ اعلان کردے کہ اس کائنات میں بڑائی ایک خدا کے سوا کسی اور کی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں کلمہ اللہ اکبر کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اذان کی ابتدا ہی اللہ اکبر کے اعلان سے ہوتی ہے۔ نماز میں بھی مسلمان تکبیر کے الفاظ کہہ کر داخل ہوتا ہے اور بار بار اللہ اکبر کہہ کر اٹھتا اور بیٹھتا ہے۔ جانور کے گلے پر چھری بھی پھیرتا ہے تو بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر پھیرتا ہے۔ نعرۂ تکبیر آج ساری دُنیا میں مسلمان کا سب سے زیادہ نمایاں امتیازی شعار ہے کیونکہ اس امت کے نبیؐ نے اپنا کام ہی اللہ کی تکبیر سے شروع کیا تھا۔

اس مقام پر ایک اور لطیف نکتہ بھی ہے جسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ جیسا کہ ان آیات کی شانِ نزول سے معلوم ہو چکا ہے، یہ پہلا موقع تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسالت کا عظیم الشان فریضہ انجام دینے کے لیے اُٹھ کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا، اور یہ بات ظاہر تھی کہ جس شہر اور معاشرے میں یہ مشن لے کر اُٹھنے کا آپ کو حکم دیا جا رہا تھا وہ شرک کا گڑھ تھا۔ بات صرف اتنی ہی نہ تھی کہ وہاں کے لوگ عام عربوں کی طرح مشرک تھے، بلکہ اس سے بڑھ کر بات یہ تھی کہ مکہ معظمہ مشرکین عرب کا سب سے بڑا تیرتھ بنا ہوا تھا اور قریش کے لوگ

اس کے مجاور تھے۔ ایسی جگہ کسی شخص کا تن تنہا اٹھنا اور شرک کے مقابلے میں توحید کا علم بلند کر دینا بڑے جان جوکھوں کا کام تھا۔ اسی لیے "اٹھو اور خبردار کرو" کے بعد فوراً ہی یہ فرمانا کہ "اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کرو" اپنے اندر یہ مفہوم بھی رکھتا ہے کہ جو ہولناک طاقتیں اس کام میں تمہیں مزاحم نظر آتی ہیں ان کی ذرا پروا نہ کرو، اور صاف صاف کہہ دو کہ میرا رب اُن سب سے بڑا ہے جو میری اس دعوت کا راستہ روکنے کے لیے کھڑے ہو سکتے ہیں۔ یہ بڑی سے بڑی ہمت افزائی ہے جو اللہ کا کام شروع کرنے والے کسی شخص کی کی جا سکتی ہے۔ اللہ کی کبریائی کا نقش جس آدمی کے دل پر گہرا جما ہوا ہو وہ اللہ کی خاطر اکیلا ساری دُنیا سے لڑ جانے میں بھی ذرہ برابر ہچکچاہٹ محسوس نہ کرے گا۔

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (آیت ۴) اور اپنے کپڑے پاک رکھو

یہ بڑے جامع الفاظ ہیں جن کے مفہوم میں بڑی وسعت ہے۔ ان کا ایک مطلب یہ ہے کہ اپنے لباس کو نجاست سے پاک رکھو، کیونکہ جسم و لباس کی پاکیزگی اور روح کی پاکیزگی دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ایک پاکیزہ روح گندے جسم اور ناپاک لباس میں نہیں رہ سکتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس معاشرے میں اسلام کی دعوت لے کر اٹھے تھے وہ صرف عقائد اور اخلاق کی خرابیوں ہی میں مبتلا نہ تھا بلکہ طہارت و نظافت کے بھی ابتدائی تصورات تک سے خالی تھا، اور حضورؐ کا کام ان لوگوں کو ہر لحاظ سے پاکیزگی کا سبق سکھاتا تھا۔ اس لیے آپ کو ہدایت فرمائی گئی کہ آپ اپنی ظاہری زندگی میں بھی طہارت کا ایک اعلیٰ معیار قائم فرمائیں۔ چنانچہ یہ اسی ہدایت کا ثمرہ ہے کہ حضورؐ نے نوعِ انسانی کو طہارتِ جسم و لباس کی وہ مفصل تعلیم دی ہے جو زمانۂ جاہلیت کے اہلِ عرب تو درکنار، آج اس زمانے کی مہذب ترین قوموں کو بھی نصیب نہیں ہے، حتیٰ کہ دُنیا کی بیشتر زبانوں میں ایسا کوئی لفظ تک نہیں پایا جاتا جو "طہارت" کا ہم معنی ہو۔ بخلاف اس کے اسلام کا حال یہ ہے کہ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں اسلامی احکام کا آغاز ہی کتاب الطہارت سے ہوتا ہے جس میں پاکی اور ناپاکی کے فرق اور پاکیزگی کے طریقوں کو انتہائی تفصیلی جزئیات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

دوسرا مفہوم ان الفاظ کا یہ ہے کہ اپنا لباس صاف ستھرا رکھو۔ راہبانہ تصورات نے دُنیا میں مذہبیت کا معیار یہ قرار دے رکھا تھا کہ آدمی جتنا زیادہ میلا کچیلا ہو اتنا ہی زیادہ وہ مقدس ہوتا ہے۔ اگر کوئی ذرا

اُجلے کپڑے ہی پہن لیتا تو سمجھا جاتا تھا کہ وہ دُنیا دار انسان ہے۔ حالانکہ انسانی فطرت میل کچیل سے نفرت کرتی ہے اور شائستگی کی معمولی حس بھی جس شخص کے اندر موجود ہو وہ صاف ستھرے انسان ہی سے مانوس ہوتا ہے۔ اسی بنا پر اللہ کے راستے کی طرف دعوت دینے والے کے لیے یہ بات ضروری قرار دی گئی کہ اس کی ظاہری حالت بھی ایسی پاکیزہ اور نفیس ہونی چاہیے کہ لوگ اسے عزت کی نگاہ سے دیکھیں اور اس کی شخصیت میں کوئی ایسی کثافت نہ پائی جائے جو طبائع کو اس سے متنفر کرنے والی ہو۔

تیسرا مفہوم اس ارشاد کا یہ ہے کہ اپنے لباس کو اخلاقی عیوب سے پاک رکھو۔ تمہارا لباس صاف ستھرا اور پاکیزہ تو ضرور ہو، مگر اس میں فخر و غرور، ریا اور نمائش، ٹھاٹھ باٹھ اور شان و شوکت کا شائبہ تک نہ ہونا چاہیے۔ لباس وہ اوّلین چیز ہے جو آدمی کی شخصیت کا تعارف لوگوں سے کراتی ہے۔ جس قسم کا لباس کوئی شخص پہنتا ہے اس کو دیکھ کر لوگ پہلی نگاہ ہی میں یہ اندازہ کر لیتے ہیں کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے۔ رئیسوں اور نوابوں کے لباس، مذہبی پیشہ وروں کے لباس، متکبّر اور برخود غلط لوگوں کے لباس، چھچورے اور کم ظرف لوگوں کے لباس، بدقوارہ اور آوارہ منش لوگوں کے لباس، سب اپنے پہننے والوں کے مزاج کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اللہ کی طرف بلانے والے کا مزاج ایسے سب لوگوں سے فطرۃً مختلف ہوتا ہے، اس لیے اس کا لباس بھی ان سب سے لازماً مختلف ہونا چاہیے۔ اس کو ایسا لباس پہننا چاہیے جسے دیکھ کر ہر شخص یہ محسوس کرے کہ وہ ایک شریف اور شائستہ انسان ہے جو نفس کی کسی بُرائی میں مبتلا نہیں ہے۔

چوتھا مفہوم اس کا یہ ہے کہ اپنا دامن پاک رکھو۔ اردو زبان کی طرح عربی زبان میں بھی پاک دامنی کے ہم معنی الفاظ اخلاقی بُرائیوں سے پاک ہونے اور عمدہ اخلاق سے آراستہ ہونے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ابن عباسؓ، ابراہیم نخعی، شعبی، عطاء، مجاہد، قتادہ، سعید بن جُبیر، حسن بصری اور دوسرے اکابر مفسرین رحمہم اللہ نے اس آیت کا یہی مطلب بیان کیا ہے کہ اپنے اخلاق پاکیزہ رکھو اور ہر قسم کی بُرائیوں سے بچو۔ عربی محاورے میں کہتے ہیں کہ فلانٌ طاھرُ الثیاب اور فلانٌ طاھرُ الذَّیل۔ "فلاں شخص کے کپڑے پاک ہیں یا اس کا دامن پاک ہے" اور اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس کے اخلاق اچھے ہیں۔ اس کے برعکس کہتے ہیں فلانٌ دَنِسُ الثیاب۔ "اس شخص کے کپڑے گندے ہیں"۔ اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بدمعاملہ آدمی ہے، اس کے قول قرار کا کوئی اعتبار نہیں۔

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ اور گندگی سے دُور رہو

(آیت ۵)

گندگی سے مراد ہر قسم کی گندگی ہے۔ خواہ وہ عقائد اور خیالات کی ہو، یا اخلاق و اعمال کی، یا جسم و لباس اور رہن سہن کی۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے گرد و پیش سارے معاشرے میں طرح طرح کی جو گندگیاں پھیلی ہوئی ہیں ان سب سے اپنا دامن بچا کر رکھو۔ کوئی شخص بھی تم پر یہ حرف نہ رکھ سکے کہ جن برائیوں سے تم لوگوں کو روک رہے ہو، ان میں سے کسی کا کوئی شائبہ تمہاری اپنی زندگی میں بھی پایا جاتا ہے۔

وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ اور احسان نہ کرو زیادہ حاصل کرنے کے لیے

(آیت ۶)

ان الفاظ کے مفہوم میں اتنی وسعت ہے کہ کسی ایک فقرے میں ان کا ترجمہ کر کے پورا مطلب ادا نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا ایک مفہوم یہ ہے کہ جس پر بھی احسان کرو بے غرضانہ کرو۔ تمہاری عطا اور بخشش اور سخاوت اور حسنِ سلوک محض اللہ کے لیے ہو۔ اس میں کوئی شائبہ اس خواہش کا نہ ہو کہ احسان کے بدلے میں تمہیں کسی قسم کے دُنیوی فوائد حاصل ہوں۔ بالفاظِ دیگر اللہ کے لیے احسان کرو، فائدہ حاصل کرنے کے لیے کوئی احسان نہ کرو۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ نبوت کا جو کام تم کر رہے ہو یہ اگرچہ اپنی جگہ ایک بہت بڑا احسان ہے کہ تمہاری بدولت خلقِ خدا کو ہدایت نصیب ہو رہی ہے، مگر اس کا کوئی احسان لوگوں پر نہ جتاؤ اور اس کا کوئی فائدہ اپنی ذات کے لیے حاصل نہ کرو۔ تیسرا مفہوم یہ ہے کہ تم اگرچہ ایک بہت بڑی خدمت انجام دے رہے ہو، مگر اپنی نگاہ میں اپنے عمل کو کبھی بڑا عمل نہ سمجھو اور کبھی یہ خیال تمہارے دل میں نہ آئے کہ نبوت کا یہ فریضہ انجام دے کر اور اس کام میں جان لڑا کر تم اپنے رب پر کوئی احسان کر رہے ہو۔

وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ اور اپنے رب کی خاطر صبر کرو

(آیت ۷)

یعنی یہ کام جو تمہارے سپرد کیا جا رہا ہے، بڑے جان جوکھوں کا کام ہے۔ اس میں سخت مصائب اور مشکلات اور تکلیفوں سے تمہیں سابقہ پیش آئے گا۔ تمہاری اپنی قوم تمہاری دشمن ہو جائے گی۔ سارا عرب تمہارے خلاف صف آرا ہو جائے گا۔ مگر جو کچھ بھی اس راہ میں پیش آئے، اپنے رب کی خاطر اس پر صبر کرنا اور اپنے فرض کو پوری ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کے ساتھ انجام دینا۔ اُس سے باز رکھنے کے لیے خوف، طمع، لالچ، دوستی، دشمنی، محبت ہر چیز تمہارے راستے میں حائل ہو گی۔ ان سب کے مقابلے میں مضبوطی کے ساتھ اپنے موقف

پر قائم رہنا۔

یہ تھیں وہ اوّلین ہدایات جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اس وقت دی تھیں جب اُس نے آپ کو یہ حکم دیا تھا کہ آپ اُٹھ کر رسالت کے کام کا آغاز فرمائیں۔ کوئی شخص اگر ان چھوٹے چھوٹے فقروں پر اور ان کے معانی پر غور کرے تو اس کا دل گواہی دے گا کہ ایک نبی کو نبوت کا کام شروع کرتے وقت اس سے بہتر کوئی ہدایات نہیں دی جا سکتی تھیں۔ ان میں یہ بھی بتا دیا گیا کہ آپ کو کام کیا کرنا ہے، اور یہ تعلیم بھی دے دی گئی کہ یہ کام کس نیت، کس ذہنیت اور کس طرزِ فکر کے ساتھ انجام دینا ہے اور اس بات سے بھی خبردار کر دیا گیا کہ اس کام میں آپکے کن حالات سے سابقہ پیش آئے گا اور ان کا مقابلہ آپ کو کس طرح کرنا ہوگا۔ آج جو لوگ تعصب میں اندھے ہو کر یہ کہتے ہیں کہ معاذ اللہ صرع کے دوروں میں یہ کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر جاری ہو جایا کرتا تھا وہ ذرا آنکھیں کھول کر ان فقروں کو دیکھیں اور خود سوچیں کہ یہ صرع کے کسی دورے میں نکلے ہوئے الفاظ ہیں یا ایک خدا کی ہدایات ہیں جو رسالت کے کام پر مامور کرتے ہوئے وہ اپنے بندے کو دے رہا ہے۔

(تفہیم القرآن، جلد ششم۔ المدثر۔ حواشی ۱ تا ۶)

خفیہ تبلیغ کا تین سالہ دَور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو تبلیغِ رسالت کی جو حکمت سکھائی تھی اس کے مطابق آپ نے اپنا کام چھوٹتے ہی اعلانِ نبوت کر دینے اور لوگوں کو دعوتِ عام دینے سے نہیں کیا بلکہ ابتدائی تین سال تک آپ خفیہ طریقے سے اسلام کو اُن سعید روحوں تک پہنچاتے رہے جو محض دلیل و برہان اور تفہیم و تذکیر سے توحید کو قبول کرنے اور شرک چھوڑ دینے پر آمادہ ہو سکتی تھیں، اور اس کے ساتھ جن پر یہ اعتماد بھی کیا جا سکتا تھا کہ وہ اِس تحریک کو اُس وقت تک راز میں رکھیں گی جب تک ہادیٔ برحق اعلانِ عام اور واشگاف دعوت الی اللہ شروع کر دینے کا فیصلہ نہ فرمائیں۔ اس کام میں سب سے زیادہ حضرت ابوبکرؓ[1] رضی اللہ عنہ کے اثرات کارگر ثابت ہوئے۔ اِس کی وجہ طبری اور ابنِ ہشام نے یہ لکھی ہے کہ وہ نہایت ملنسار، خوش خلق اور اپنی قوم میں مقبول و محبوب تھے۔ قریش میں کوئی شخص ان سے زیادہ اَنساب کا علم نہ رکھتا تھا اور نہ ان سے زیادہ کوئی

---

[1] ان کا اصل نام عبداللہ بن عثمان ابی قُحافہ تھا۔ لیکن ابوبکر ان کی کنیت اس قدر مشہور ہوئی کہ اصل نام اس کے پیچھے چھپ گیا۔ زمخشری نے لکھا ہے کہ ان کو پاکیزہ خصلتوں میں اِبْتِکار (پیش پیش ہونے) کی وجہ سے ابوبکر کہا جاتا تھا۔ جاہلیت ہی میں وہ اس نام سے مشہور ہو چکے تھے۔

یہ جانتا تھا کہ قریش میں اچھے اور بُرے کون ہیں اور کس کے کیا اوصاف ہیں۔ تجارت پیشہ تھے اور اپنے حسنِ معاملہ کے لیے مشہور تھے۔ ان کی قوم کے لوگ ان کے علم، ان کی تجارت اور ان کے عُمدہ برتاؤ کی وجہ سے بکثرت ان سے ملتے اور ان کے پاس آکر بیٹھتے تھے۔ اِس موقع سے فائدہ اُٹھا کر انہوں نے جن جن لوگوں پر اعتماد کیا ان تک دعوت پہنچائی اور ایک اچھی خاصی تعداد ان کی تبلیغ سے متاثر ہو کر مسلمان ہو گئی۔ پھر جو جو مسلمان ہوتا گیا وہ آگے اپنے حلقۂ احباب میں نیک روحوں کو تلاش کر کر کے اندر ہی اندر اسلام پھیلاتا گیا۔ اُس زمانہ میں مسلمان چھُپ چھُپ کر مکّہ کی سنسان گھاٹیوں میں نماز پڑھتے تھے تاکہ کسی کو ان کی تبدیلیِ دین کا پتہ نہ چل سکے۔

دارِ ارقم میں مرکزِ تبلیغ و اجتماع کا قیام ڈھائی سال سے کچھ زیادہ مدت ہی گزری تھی کہ ایک ایسا واقعہ پیش آگیا جس سے اندیشہ ہوا کہ کہیں کفارِ مکہ سے قبل از وقت تصادم شروع نہ ہو جائے۔ ابن اسحٰق کا بیان ہے کہ ایک روز مسلمان مکہ کی ایک گھاٹی میں نماز پڑھ رہے تھے کہ مشرکین کے ایک گروہ نے انہیں دیکھ لیا اور ان کو سخت سُست کہنا شروع کیا۔ بات بڑھتے بڑھتے لڑائی تک پہنچ گئی اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے ایک شخص کو اونٹ کی ہڈی کھینچ ماری جس سے اس کا سر پھٹ گیا۔ ابن جریر اور ابن ہشام نے اس واقعہ کو مختصراً بیان کیا ہے، مگر حافظ اُموی نے اپنی مغازی میں اس کی پوری تفصیل دی ہے اور بتایا ہے کہ وہ شخص جس کا سر پھٹا تھا وہ بنی تیم کا عبداللہ بن خطل تھا۔ اس کے بعد حضورؐ نے بلا تاخیر حضرت ارقمؓ بن ابی ارقم کے مکان کو، جو صفا کے قریب واقع تھا مسلمانوں کے اجتماع اور دعوت و تبلیغ کا مرکز بنا دیا تاکہ مسلمان یہیں جمع ہو کر نماز بھی پڑھیں اور جو جو لوگ خفیہ طریقہ سے مسلمان ہوتے جائیں وہ یہاں آتے رہیں۔ اسلام کی تاریخ میں اس دارِ ارقم کو لازوال شہرت حاصل ہوئی۔ تین سال کی خفیہ دعوت کا دور ختم ہونے اور علانیہ دعوتِ عام شروع ہو جانے کے بعد بھی یہ مسلمانوں کا مرکز رہا۔ اِسی میں حضورؐ تشریف فرما رہتے تھے ، یہیں آکر مسلمان آپ کے پاس جمع ہوتے تھے، اور شعب ابی طالب کی محصوری تک (جس کا ذکر ہم آگے کریں گے) اِسی کو دعوتِ اسلام میں مرکزی حیثیت حاصل رہی۔

تین سال کی خفیہ دعوت میں کتنا کام ہوا اب قبل اس کے کہ ہم علانیہ دعوت کے دور پر کلام شروع کریں ہمیں یہ دیکھ لینا چاہیے کہ خفیہ دعوت کے اِن تین سالہ دور میں کتنا کام ہوا تھا، قریش کے کن کن قبیلوں کے کون کون اور کتنے لوگ مسلمان ہو چکے تھے، اور قریش سے باہر کے لوگوں اور موالی اور غلاموں اور لونڈیوں میں سے کس کس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ ذیل میں ہم ان کی وہ فہرست دیتے ہیں جو بڑی تلاش و تجسس کے بعد ہم نے جمع کی ہے، کیونکہ ان کی پوری فہرست کسی جگہ بھی یکجا نہیں ملتی۔

بنی ہاشم میں سے: (۱) جعفرؓ بن ابی طالب

(۲) حضرت جعفرؓ کی بیوی اسماءؓ بنت عُمیس خثعمیہ [1]

(۳) حضرت صفیہؓ بنت عبدالمطلب (حضورؐ کی پھوپھی اور حضرت زبیرؓ کی والدہ)

(۴) اَرْوَیٰؓ بنت عبدالمطلب (طُلَیبؓ بن عُمَیر کی والدہ اور حضورؐ کی پھوپھی)

بنی المطّلب میں سے: (۵) عُبَیدہؓ بن الحارث بن مُطّلب

بنی عبد شمس بن عبدِمناف میں سے: (۶) ابو حُذیفہؓ بن عُتبہ بن ربیعہ

(۷) ابو حُذیفہؓ کی بیوی سَہلہؓ بنت سُہَیل بن عمرو

بنی امیہ میں سے: (۸) عثمانؓ بن عفان

(۹) اُن کی والدہ اَرْوَیٰؓ بنت کُرَیز

(۱۰) خالد بن سعیدؓ بن العاص بن امیہ ابو اُحیحہ

(۱۱) اُن کی بیوی اُمَیْنہؓ بنت خلف الخزاعیہ (بعض نے اُن کا نام اُمیہ لکھا ہے)

(۱۲) ام حَبیبہؓ بنت ابی سفیان (پہلے عبیداللہ بن جحش کے نکاح میں تھیں۔ بعد میں ان کو ام المومنین بننے کا شرف حاصل ہوا)

حلفائے بنی امیہ میں سے: (۱۳) عبداللہؓ بن جحش بن رِئاب

(۱۴) ابو احمدؓ بن جحش

(۱۵) عبیداللہ بن جحش [2]

(یہ بنی غنم بن دُودان میں سے تھے۔ حضورؐ کی پھوپھی اُمیمہ بنت عبدالمطلب کے بیٹے اور ام المومنین حضرت زینبؓ کے بھائی تھے۔)

بنی تیم میں سے: (۱۶) اَسماءؓ بنت ابی بکرؓ

(۱۷) ام رُومانؓ (حضرت ابوبکرؓ کی اہلیہ اور حضرت عائشہؓ اور عبدالرحمٰنؓ بن ابی بکر کی والدہ)

(۱۸) طَلحہؓ بن عبیداللہ

(۱۹) اُن کی والدہ صَعبہؓ بنت الحضرمی

---

[1] خواتین کا ذکر ہم زیادہ تر ان کے شوہروں یا بیٹوں کے ساتھ کریں گے۔ البتہ کہیں کہیں ان کا ذکر اُن کے اپنے خاندان کی نسبت سے بھی کریں گے۔

[2] یہ شخص مہاجرین حبشہ میں سے تھا۔ اپنی بیوی ام حبیبہؓ کے ساتھ اس نے ہجرت کی۔ پھر حبش میں عیسائی ہو کر مرا۔

(۲۰) حارثؓ بن خالد

حلفائے بنی تیم میں سے: (۲۱) صُہیبؓ بن سنان الرومی

بنی اسد بن عبدالعزیٰ میں سے: (۲۲) حضرت زبیرؓ بن العوام (حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے اور حضورؐ کے پھوپھی زاد بھائی)

(۲۳) خالدؓ بن حزام (حکیم بن حزام کے بھائی اور حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے)

(۲۴) اسودؓ بن نوفل

(۲۵) عمروؓ بن اُمیّہ

بنی عبدالعزیٰ بن قصیّ میں سے: (۲۶) یزیدؓ بن زمعہ بن الاسود

بنی زُہرہ میں سے: (۲۷) عبدالرحمٰنؓ بن عوف

(۲۸) ان کی والدہ شفاءؓ بنت عوف

(۲۹) سعدؓ بن ابی وقاص

(۳۰) ان کے بھائی عُمیرؓ بن ابی وقاص

(۳۱) ان کے بھائی عامرؓ بن ابی وقاص

(۳۲) مُطّلِبؓ بن ازہر (عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے چچا زاد بھائی)

(۳۳) ان کی بیوی رَملہؓ بنت ابی عوف سہمیّہ

(۳۴) طُلیبؓ بن ازہر

(۳۵) عبداللہؓ بن شہاب (یہ ننھیال کی طرف سے امام زُہری کے جد تھے)

حلفائے بنی زہرہ میں سے: (۳۶) عبداللہؓ بن مسعود (یہ قبیلۂ ھُذَیل میں سے تھے اور مکہ میں بنی زہرہ کے حلیف کی حیثیت سے رہتے تھے)

(۳۷) عتبہؓ بن مسعود (برادر عبداللہؓ بن مسعود)

(۳۸) مقدادؓ بن عمرو الکندی (اسود بن عبد یغوث زُہری نے ان کو اپنا حلیف اور مُتبنّٰی بنا رکھا تھا)

(۳۹) خبّابؓ بن الارت

(۴۰) شُرَحبیلؓ بن حسنۃ الکندی

(۴۱) جابرؓ بن حسنہ (شرحبیل بن حسنہ کے بھائی)

(۴۲) جُنادہؓ بن حسنہ (" " ")

بنی عدی میں سے : (۴۳) سعیدؓ بن زید عمرو بن نفیل (حضرت عمرؓ کے بہنوئی اور چچازاد بھائی)
(۴۴) ان کی بیوی فاطمہؓ بنت الخطاب (حضرت عمرؓ کی بہن)
(۴۵) زیدؓ بن الخطاب (حضرت عمرؓ کے بڑے بھائی)
(۴۶) عامر بن ربیعہؓ العنزی (حلیف بنی عدی، خطاب نے ان کو بیٹا بنا رکھا تھا)
(۴۷) ان کی بیوی لیلیٰؓ بنت ابی حثمہ
(۴۸) معمرؓ بن عبداللہ بن نضلہ
(۴۹) نعیمؓ بن عبداللہ النحام
(۵۰) عدیؓ بن نضلہ
(۵۱) عروہؓ بن ابی اثاثہ (عمرو بن العاص کے ماں جائے بھائی)
(۵۲) مسعودؓ بن سوید بن حارثہ بن نضلہ

حلفائے بنی عدی میں سے : (۵۳) واقدؓ بن عبداللہ (ان کو بھی خطاب نے حلیف اور متبنّیٰ بنا رکھا تھا)
(۵۴) خالدؓ بن بکیر بن عبد یالیل اللیثی
(۵۵) ایاسؓ " "
(۵۶) عامرؓ " "
(۵۷) عاقلؓ " "

بنی عبدالدار میں سے : (۵۸) مصعبؓ بن عمیر
(۵۹) ابوالرومؓ بن عمیر (مصعبؓ بن عمیر کے بھائی)
(۶۰) فراسؓ بن النضر
(۶۱) جہمؓ بن قیس

بنی جمح میں سے : (۶۲) عثمانؓ بن مظعون
(۶۳) ان کے بھائی قدامہؓ بن مظعون
(۶۴) ان کے بھائی عبداللہؓ بن مظعون
(۶۵) سائبؓ بن عثمانؓ بن مظعون

(۶۶) مَعمرؓ بن الحارث بن مَعمر

(۶۷) ان کے بھائی حاطبؓ بن الحارث

(۶۸) ان کی بیوی فاطمہؓ بنت مُجَلّل العامریہؓ

(۶۹) مَعمر کے بھائی خطابؓ بن الحارث

(۷۰) ان کی بیوی فُکَیہہؓ بنت یسار

(۷۱) سُفیانؓ بن مَعمر

(۷۲) نُبَیہؓ بن عثمان

بنی سہم میں سے: (۷۳) عبداللہؓ بن حُذافہ

(۷۴) خُنَیسؓ بن حُذافہ (حضرت عمرؓ کے داماد۔ ام المومنین حضرت حفصہؓ کے پہلے شوہر)

(۷۵) ہشامؓ بن العاص بن وائل

(۷۶) حارثؓ بن قیس

(۷۷) ان کے بیٹے بشیرؓ بن حارث

(۷۸) ان کے دوسرے بیٹے مَعمرؓ بن حارث

(۷۹) قیسؓ بن حُذافہ (عبداللہؓ بن حُذافہ کے بھائی)

(۸۰) ابوقیسؓ بن الحارث

(۸۱) عبداللہؓ بن الحارث

(۸۲) سائبؓ بن الحارث

(۸۳) حجاجؓ بن الحارث

(۸۴) بِشرؓ بن الحارث

(۸۵) سعیدؓ بن الحارث

حلفائے بنی سہم میں سے: (۸۶) عُمیرؓ بن رِئاب

(۸۷) مَحمِیہؓ بن الجزء (یہ حضرت عباسؓ کی بیوی ام الفضلؓ کے ماں جائے بھائی تھے)

بنی مخزوم میں سے: (۸۸) ابوسلمہ عبداللہؓ بن عبدالاسد (حضورؐ کے پھوپھی زاد اور رضاعی بھائی۔ ام المومنین ام سلمہؓ کے پہلے شوہر)

(۸۹) ان کی بیوی ام سلمہؓ (یہ اور ان کے شوہر ابو سلمہؓ ابو جہل کے قریبی رشتہ دار تھے)

(۹۰) ارقمؓ بن ابی الارقم (جن کے دار ارقم کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔)

(۹۱) عیاشؓ بن ابی ربیعہ (ابو جہل کے ماں جائے بھائی۔ حضرت خالد بن ولید کے چچازاد بھائی)

(۹۲) ان کی بیوی اسماءؓ بنت سلامہ تمیمیہ۔

(۹۳) ولیدؓ بن ولید بن مغیرہ

(۹۴) ہشامؓ بن ابی حذیفہ

(۹۵) سلمہؓ بن ہشام

(۹۶) ہاشمؓ بن ابی حذیفہ

(۹۷) ھبارؓ بن سفیان

(۹۸) ان کے بھائی عبداللہؓ بن سفیان

حلفائے بنی مخزوم میں سے: (۹۹) یاسرؓ (عمارؓ بن یاسر کے والد)

(۱۰۰) عمارؓ بن یاسر

(۱۰۱) ان کے بھائی عبداللہؓ بن یاسر

بنی عامر بن لؤی میں سے: (۱۰۲) ابو سبرہؓ بن ابی رہم (حضورؐ کی پھوپھی برّہ بنت عبدالمطلب کے بیٹے)

(۱۰۳) ان کی بیوی ام کلثومؓ بنت سہیل بن عمرو (ابو جندلؓ کی بہن)

(۱۰۴) عبداللہؓ بن سہیل بن عمرو

(۱۰۵) حاطبؓ بن عمرو (سہیل بن عمرو کے بھائی)

(۱۰۶) سلیطؓ بن عمرو (سہیل بن عمرو کے بھائی۔ اصابہ میں ان کو سہیل بن عمرو کا بھتیجا لکھا ہے)

(۱۰۷) سکرانؓ بن عمرو (سہیل بن عمرو کے بھائی۔ یہ ام المومنین حضرت سودہؓ بنت زمعہ کے پہلے شوہر تھے)

(۱۰۸) ان کی بیوی سودہؓ بنت زمعہ (جو سکران کی وفات کے بعد ام المومنین بنیں)

(۱۰۹) سلیطؓ بن عمرو کی بیوی لیقظہؓ بنت علقمہ (اصابہ میں ام یقظہ لکھا ہے اور ابن سعد نے فاطمہ بنت علقمہ ان کا نام بتایا ہے)

(۱۱۰) مالکؓ بن زمعہ (حضرت سودہؓ کے بھائی)

(۱۱۱) ابنِ امِّ مکتومؓ

بنی فہر بن مالک میں سے: (۱۱۲) ابو عُبیدہؓ بن الجراح

(۱۱۳) سُہیلؓ بن بَیضاء

(۱۱۴) سعیدؓ بن قیس

(۱۱۵) عمروؓ بن الحارث بن زُھیر

(۱۱۶) عثمانؓ بن عبد غَنم بن زُھیر (حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے پھوپھی زاد بھائی)

(۱۱۷) حارثؓ بن سعید

بنی عبدِ قصیّ میں سے: (۱۱۸) طُلیبؓ بن عُمیر (حضورؐ کی پھوپھی اَروی بنت عبدالمطلب کے بیٹے)

یہ وہ لوگ تھے جو قریش کے بڑے بڑے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ ایک اچھی خاصی تعداد موالی، غلاموں اور لونڈیوں کی بھی تھی جنہوں نے خفیہ دعوت کے ان تین سالوں میں اسلام قبول کیا۔ ان کے نام یہ ہیں:۔

(۱۱۹) امِّ ایمنؓ برکہ بنت ثعلبہ جنہوں نے بچپن سے حضورؐ کو گود میں پالا تھا۔

(۱۲۰) زِنّیرہؓ رومیہ۔ عمرو بن المؤمّل کی آزاد کردہ لونڈی

(۱۲۱) بلالؓ بن ابی رباح - یہ اُمیّہ بن خلف کے غلام تھے۔

(۱۲۲) اُن کی والدہ حمامہؓ

(۱۲۳) ابو فُکیہہؓ یسار الجُہنی۔ صفوان بن اُمیّہ کے آزاد کردہ غلام

(۱۲۴) لبیبہؓ، مؤمّل بن حبیب کی لونڈی

(۱۲۵) امِّ عُبیسؓ، بنی تیم بن مُرّہ یا بنی زہرہ کی لونڈی (پہلا قول زبیر بن بکّار کا ہے اور دوسرا بلاذری کا)

(۱۲۶) عامرؓ بن فُہیرہ، طُفیل بن عبداللہ کے غلام

(۱۲۷) سُمیّہؓ (حضرت عمّارؓ بن یاسر کی والدہ اور ابو حذیفہ بن مُغیرہ مخزومی کی لونڈی)

ان کے علاوہ غیر قریش میں سے جن لوگوں نے مکّہ کے اس ابتدائی دور میں اسلام قبول کیا وہ یہ تھے:

(۱۲۸) مِحجنؓ بن الادرع الاسلمی

(۱۲۹) مسعودؓ بن ربیع بن عمرو۔ یہ بنی الھُون بن خُزَیمہ کے قبیلۂ قارہ سے تھے۔

اس طرح ابتدائی چار مسلمانوں کے ساتھ ان ۱۲۹ اصحاب کے ملنے سے اُن لوگوں کی کُل تعداد ۱۳۳ بن جاتی ہے جو حضوؐر کی دعوتِ عام شروع ہونے سے پہلے آپ پر ایمان لا کر جماعت مسلمین میں شامل ہو چکے تھے۔ یہ وہ صحیح الفکر اور سلیم الفطرت لوگ تھے جنہوں نے محض دلیل اور افہام و تفہیم سے شرک کی بُرائی کو سمجھا، توحید کی حقیقت کو مانا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول تسلیم کیا، قرآن کو کلام الٰہی کی حیثیت سے اپنے لیے سرچشمۂ ہدایت قرار دیا، اور آخرت کی زندگی کو یقینی حقیقت سمجھا۔ انتنے مخلص اور دینی فہم رکھنے والے کارکن تیار کر لینے کے بعد حضوؐر نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے علی الاعلان دعوتِ اسلام کا کام شروع فرمایا۔ (اضافہ از مؤلف)

ضروری التماس

خریداران ترجمان القرآن و ایجنٹ حضرات کی خدمت میں گذارش ہے کہ خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر یا ایجنسی نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں۔ منی آرڈر کوپن پر اپنا مکمل پتہ ڈاک خانہ تحصیل و ضلع خوشخط اور واضح الفاظ میں درج ہونا چاہیے۔ نیز منی آرڈر ارسال کرتے وقت ساتھ ہی بذریعہ خط ترسیل رقم کی اطلاع کر دیا کریں۔ ان امور کی پابندی کے بغیر دفتر کو عدم تعمیل کی شکایت کا ذمہ دار ٹھیرانا درست نہیں ہوگا۔

منیجر

نورِ ایمان سے منوّر ضمیر کا اعجاز

شیخ یوسف القرضاوی
ترجمہ :۔ عبدالحمید صدیقی

انسان خود اپنے وضع کردہ قوانین کی پابندی سے بھاگتا ہے اور ان کے اجراء و نفاذ پر ذاتی مفادات کے تحفظ کی خاطر سو طرح کی تدابیر سوچتا ہے۔ مثال کے طور پر حکومتیں کار و بارِ سلطنت چلانے کے لیے ٹیکس عائد کرتی ہیں۔ امنِ عامہ بحال رکھنے اور معاشرتی جرائم کے سدِباب کے لیے قانونی تعزیرات نافذ کرتی ہیں۔ آپس کے معاملات کو درست رکھنے اور بیع و شریٰ کے صحیح انعقاد کی خاطر اصول و ضوابط طے کرتی ہیں۔ سیاست و حکمرانی کے باب میں ایسے اقدامات کی سختی سے ممانعت کر دی جاتی ہے جن سے ملک و قوم کا مفاد متاثر ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد عملاً ہوتا یہ ہے کہ قوانین و ضوابط کی کھلم کھلا مخالفت کی جاتی ہے۔ ٹیکسوں کی چوری اور جرائم کا ارتکاب سرِعام ہوتا ہے۔ قانون کا احترام نہ حکام کرتے ہیں اور نہ عوام ہی اس کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ لوگ قوانین کی افادیت و اہمیت کو سمجھنے کے باوجود ان سے انحراف کیوں کرتے ہیں؟ اس کا جواب صرف یہ ہے کہ ان کا ضمیر بیدار نہیں ہوتا اور اسے ایمان کی حرارت نصیب نہیں ہوتی، کیونکہ جو ضمیر ایمان کی بدولت بیدار ہو چکا ہو اس پر عقلِ عیار کا کوئی حیلہ کارگر نہیں ہو سکتا۔ آیئے ذرا اسلامی تاریخ کے اوراق الٹ کر دیکھیں کہ نورِ ایمان سے منور قلوب و ضمائر کس طرح زندگی کے ہر میدان میں انسان کی رہنمائی کرتے ہیں۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے بھیجا۔ میں ایک آدمی کے پاس گیا اور اسے اپنے تمام اونٹ جمع کرنے کے لیے کہا۔ جب وہ سارے میرے سامنے حاضر کر دیے گئے تو میں نے حساب لگا کر اسے بتایا کہ آپ کو صرف ایک سال کا بچہ بطور زکوٰۃ ادا کرنا ہوگا۔ اس نے کہا کہ ایک سال کا بچہ تو نہ دودھ دے گا، نہ سواری کے قابل ہوگا۔ آپ اس کے بجائے یہ جوان اور موٹی تازی اونٹنی لے جائیں۔ میں نے کہا کہ جس چیز کو لینے کا مجھے حکم نہیں دیا گیا اسے کیسے لے

سکتا ہوں۔ ہاں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہاں سے قریب ہی ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو حضورؐ کے پاس چلے جاتے ہیں۔ پھر اگر آپؐ نے اسے قبول کر لیا تو میں وصول کر لوں گا، بصورتِ دیگر آپ کا مال آپ کو مبارک۔
اس نے کہا ٹھیک ہے اور میرے ساتھ چل پڑا اور وہ اونٹنی جو مجھے پیش کر رہا تھا ساتھ لے لی۔ بارگاہِ رسالتؐ میں پہنچ کر کہنے لگا: "یا رسول اللہ آپ کا قاصد میرے پاس پہنچا تاکہ میرے مال کا صدقہ وصول کرے اور اس سے پیشتر میرے مال سے صدقہ وصول کرنے کے لیے نہ کبھی آپ تشریف لائے نہ آپ کا کوئی قاصد آیا۔ میں نے اس کے سامنے اپنے سارے اونٹ پیش کر دیے۔ اس کا کہنا ہے کہ ایک سال کا بچہ ادا کروں، لیکن وہ تو اللہ کے رسولؐ نہ دودھ دینے کے قابل ہوتا ہے نہ سواری کے۔ میں نے اس کے بجائے اُسے ایک جوان موٹی تازی اونٹنی دی مگر یہ اُسے لینے سے انکار کرتا ہے۔ اونٹنی میں اپنے ساتھ لے آیا ہوں اے اللہ کے رسول آپ قبول فرمالیں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تمہارے ذمہ واجب الادا صدقہ تو وہ بچہ ہی ہے تاہم اگر تم زیادہ دینا چاہتے ہو تو اس کا اللہ آپ کو اجر دے گا اور ہم اسے قبول کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد آپ نے اس اونٹنی کو وصول کرنے کا حکم دے دیا اور اس صحابیؓ کے مال میں برکت کی دعا کی ______

آپ نے غور کیا اس واقعہ میں فریقین کے اندر کونسا مقدس جذبہ کار فرما ہے؟ یہ ضمیر کی آواز تھی، اُس ضمیر کی جس پر ایمان کا رنگ چڑھ چکا تھا۔

حضرت ماعزؓ بن مالک مشہور صحابی تھے رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ ایک دفعہ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ میں نے اپنی جان پر ظلم کیا ہے اور زنا کر بیٹھا ہوں۔ اب چاہتا ہوں کہ آپؐ مجھے پاک کر دیں"۔ رسولِ پاک نے فرمایا شاید تو نے چھیڑ چھاڑ کی ہو یا بوس و کنار کیا ہو، مگر حضرت ماعزؓ نے ہر بار تردید کر دی اور گناہ کا اعتراف کرتے رہے اور اس بات پر مُصر رہے کہ حد جاری کر کے انہیں پاک کیا جائے۔ بالآخر رسول پاک نے انہیں رجم کرنے کا حکم صادر فرما دیا اور حضرت ماعزؓ نے اپنے اوپر بخوشی حد نافذ کرائی رضی اللہ تعالےٰ عنہ۔

اور یہ ایک مسلمان خاتون ہیں۔ رسولِ پاک کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتی ہیں۔ "اے اللہ کے رسول میں نے زنا کا ارتکاب کیا ہے مجھے پاک کر دیجیے"۔ رسول اللہ اسے لوٹا دیتے ہیں مگر اگلے دن وہ پھر آجاتی ہیں اور کہتی ہیں۔ "یا رسول اللہ آپ نے مجھے کیوں لوٹا دیا شاید آپ ماعز کی طرح مجھ پر سے حد کو ٹالنا چاہتے ہیں، بخدا میں حاملہ ہو گئی ہوں"۔ آپ نے فرمایا اگر یہ بات ہے تو اب چلی جا اور بچے کی پیدائش کے بعد

آنا۔ عورت چلی گئی۔ دن پر دن گزرتے گئے مگر اس کے ضمیر کی خلش نہ گئی۔ گناہ سے پاک ہونے کا خیال اسے ہر وقت مضطرب رکھتا۔ آخر وضع حمل ہو گیا اور بچے کو لے کر وہ ایک بار پھر دربارِ رسالت میں حاضر ہو گئی۔ رسول اللہ نے فرمایا ابھی حد جاری نہیں کی جا سکتی۔ جا اور اس بچے کو دودھ پلا اور جب زمانۂ رضاعت گزر جائے اور بچہ روٹی وغیرہ کھانے لگے تو پھر آنا۔ بیدار ضمیر خاتون واپس چلی جاتی ہے اور پورے دو سال بچے کو دودھ پلاتی ہے مگر اس عرصے میں کبھی ایک لمحے کے لیے بھی اس کے دل و دماغ سے گناہ کا تصوّر محو نہیں ہوتا۔ وہ آخرت میں اس جرم کی سزا کا خیال کر کے کانپ کانپ جاتی ہے۔ آخر جب بچے نے دودھ پینا چھوڑ دیا تو وہ اس کے ہاتھ میں روٹی کا ایک ٹکڑا دے کر رسول اللہ کی خدمت میں پھر پہنچ گئی۔ "یا رسول اللہ اب بچہ میرا دودھ نہیں پیتا۔ اب یہ کھانا کھانے لگا ہے"۔ اس کے بعد اجرائے حد میں مزید تاخیر نہیں کی جا سکتی تھی۔ چنانچہ آپ نے اسے رجم کرنے کا حکم دے دیا۔ حضرت خالدؓ بن ولید بھی اُن لوگوں میں سے تھے جو اسے پتھر مار رہے تھے انہوں نے اس کے سر پر پتھر مارا جس سے خون کے چھینٹے حضرت خالد کے چہرے پر جا پڑے۔ اس پر ان کے مُنہ سے گالی نکل گئی۔ اللہ کے نبی نے سُنا تو فرمایا۔ اے خالد رک جا۔ اُس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اس خاتون نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر اس کی توبہ کو مدینہ کے ستّر گنہگاروں پر تقسیم کر دیا جائے تو سب کی مغفرت کے لیے کافی ہو۔ کیا اس سے افضل بھی کسی کی توبہ ہو سکتی ہے؟ اس نے تو خُدا کے لیے اپنی جان دے دی۔

کیا دُنیا کے کسی قانونِ تعزیرات کی اس درجہ اطاعت کی گئی ہے؟ نہیں اور یقیناً نہیں۔ دُنیا کے قوانین کا نفاذ فوج، پولیس یا حکومت کے دوسرے اہلکاروں کے ہاتھوں بجبر و اکراہ ہوتا ہے جس سے بچاؤ کی کئی صورتیں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ مگر اسلامی قانون کی تنفیذ پر ایک مومن کو اس کا ضمیر مجبور کرتا ہے اور اس کی پکار پر لبیک کہنا ہی پڑتا ہے۔

اس کے بعد دو چار واقعات اور سُنیے جن کا تعلق امانت و دیانت اور حسنِ معاملہ سے ہے اور جن سے متعلق قوانین پر عمل درآمد ایمان و ضمیر کے ماسوا کوئی طاقت نہیں کرا سکتی۔

امیر المومنین حضرت عمرؓ بن الخطاب نے حکم جاری کر دیا کہ اشیائے خوردنی میں ملاوٹ قابلِ تعزیر جرم ہے۔ کوئی مسلمان مرد اور عورت یہ حرکت نہ کرے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے مَنْ غَشَّ فَلَیْسَ مِنَّا۔ جس نے دھوکا دیا وہ ہم میں سے نہیں۔ اِدھر فاروقِ اعظمؓ کا یہ حکم تھا اور اُدھر ایک عورت اپنی

بیٹی سے کہہ رہی تھی دودھ میں پانی ڈال دو کچھ زیادہ پیسے وصول ہو جائیں گے۔ بیٹی نے ماں کو امیرالمومنین کا حکم یاد دلایا تو ماں نے کہا امیرالمومنین یہاں کہاں ہے؟ وہ ہمیں دیکھ تو نہیں رہا۔ بیٹی نے جواب دیا اگر امیرالمومنین ہمیں نہیں دیکھتا تو خدا تو ہمیں دیکھ رہا ہے۔ اماں جان میں دودھ میں پانی ہرگز نہیں ملاؤں گی۔ یہ اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ دھوکا کرنا ہے۔ یہ سنگین جرم ہے۔

مؤرخ طبری نے ذکر کیا کہ جب مسلمان مدائن میں فاتحانہ داخل ہوئے تو انہوں نے مقبوضہ غنائم ایک جگہ جمع کر دیے۔ ایک صاحب آئے اور ایک بیش قیمت چیز خزانچی کو دے دی۔ لوگوں نے کہا ایسی بہترین چیز تو ہم نے آج تک نہیں دیکھی اور ہمارے پاس موجود اشیاء میں کوئی بھی اس کے برابر نہیں۔ آپ نے اس پر قبضہ کیا تھا؟ انہوں نے جواب دیا اگر خدا کا خوف نہ ہوتا تو کبھی اسے تمہارے پاس لے کر نہ آتا۔ لوگوں نے سمجھ لیا کہ آدمی بڑے مرتبہ و مقام کا حامل ہے۔ استفسار کرنے لگے آپ کون ہیں؟ انہوں نے کہا میں یہ نہیں بتاؤں گا، نہ آپ کو اور نہ کسی اور کو۔ آپ میری مدح و تعریف کرنے لگیں گے حالانکہ میں نے یہ کام صرف خدا کی رضا کے لیے کیا ہے اور وہی تمام تعریفوں کا مستحق ہے۔ لوگوں نے ایک آدمی کو اشارہ کیا کہ اس کے پیچھے پیچھے جاؤ اور اس کے ساتھیوں سے اس کا نام معلوم کرو۔ اس نے ایسا ہی کیا تو پتہ چلا کہ آنجناب عامر بن عبد قیس ہیں۔

حضرت عبداللہ بن دینار نے فرمایا کہ میں ایک مرتبہ امیرالمومنین عمرؓ ابن الخطاب کے ہمراہ مکہ کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں ایک مقام پر ہم نے رات گزاری۔ وہاں پہاڑ پر سے ایک چرواہا ریوڑ سمیت نیچے اترا اور ہمارے پاس سے گزرا۔ امیرالمومنین نے اسے کہا اے چرواہے ان میں سے ایک بکری میرے ہاتھ فروخت کر دے۔ اس نے جواب دیا میں غلام ہوں اور یہ آقا کا ریوڑ ہے۔ آپ نے بر بنائے آزمائش فرمایا اپنے آقا سے کہہ دینا کہ اسے بھیڑیا کھا گیا ہے۔ چرواہا بولا تو اللہ کو کیا جواب دوں گا۔ اس پر عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رو پڑے اور صبح کے وقت اس غلام کے ساتھ گئے اور آقا سے خرید کر اسے آزاد کر دیا اور فرمایا اس کلمہ کی بدولت تجھے دنیا میں تو آزادی نصیب ہو گئی ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ آخرت میں بھی یہ تجھے نجات دلا دے گا۔

اب ذرا امورِ سیاست و حکمرانی کی طرف آئیے اور دیکھئے کہ ایمان کا تربیت کردہ ضمیر کس طرح مسند حکومت پر فروکش عمّال کو راہِ راست پر رکھتا ہے اور با اختیار ہونے کے باوجود ظلم و زیادتی کا ادنیٰ تصور بھی ان کے دماغ میں نہیں ابھرتا۔ نہ قومی دولت پر خود کو متصرف پا کر خیانت و بددیانتی کا کوئی خیال ان کے دل میں پیدا ہوتا ہے

امیرالمومنین عمرؓ بن الخطاب کے عہدِ خلافت میں ایک دفعہ قحط پڑ گیا۔ آپ نے اس عرصے میں معمول کا کھانا ترک کر دیا اور تیل یا روغن کے ساتھ روٹی چبا لیتے۔ نتیجۃً آپ کا رنگ سیاہ پڑ گیا۔ رفقائے کار نے یہ دیکھا تو عرض کیا۔ اے امیرالمومنین امورِ سلطنت کا بار آپ کے کاندھوں پر ہے۔ آپ اکل و شرب کے معاملے میں اتنا پرہیز نہ کریں، مبادا آپ کی صحت بالکل ہی جواب دے جائے۔ اس پر آپ نے فرمایا بئس الوالی انا ان شبعت و الناس جیاع۔ میں بدترین قسم کا حکمران ہوں گا۔ اگر خود سیر ہو کر کھاؤں اور لوگ بھوکے رہیں۔

اس زمانے میں آپ نے ایک دن اپنے خاندان کی ایک ننھی بچی دیکھی جو بھوک سے نڈھال ہو رہی تھی اور چلتے ہوئے گر گر پڑتی تھی۔ آپ نے پوچھا یہ کون ہے؟ آپ کے بیٹے عبداللہؓ نے جواب دیا میری بیٹی ہے۔ فرمایا اس کو کیا ہے؟ حضرت عبداللہؓ نے کہا۔ "سامانِ خورد و نوش آپ کے قبضے میں ہے جسے آپ نے ہم سے روک رکھا ہے، اسی کا نتیجہ ہے جو آپ دیکھ رہے ہیں"۔ بیٹے کی شکایت سنی تو آپ نے فرمایا عبداللہؓ میرے اور آپ کے درمیان فیصلہ کن چیز اللہ کی کتاب ہے، بخدا! میں آپ حضرات کو وہی چیز دے سکتا ہوں جس کا اللہ نے آپ کو حقدار بنایا ہے۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ دوسروں کو ان کے حقوق سے محروم کر کے تمہیں نوازتا رہوں اور یوں خدا و خلق کی نظروں میں خائن قرار پاؤں"۔

امام ابن کثیرؒ نے البدایہ والنہایہ میں عمرؓ فاروق کے کارہائے نمایاں اور عظیم الشان فتوحات کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے "آپ اللہ سے بہت زیادہ ڈرتے، سادہ زندگی بسر کرتے اور معمولی خوراک کھاتے تھے۔ بایں ہمہ دینِ حق کے تقاضوں کو پورا کرنے میں بڑے مستعد اور شدید تھے۔ سادگی کا یہ عالم تھا کہ لباس میں خود چمڑے کے پیوند لگا لیتے پانی سے بھرا ہوا مشکیزہ اٹھا لاتے، گدھے کی ننگی پشت پر سوار ہو جاتے، بہت کم ہنستے اور کبھی کسی سے مذاق نہ کرتے۔ آپ کی انگوٹھی پر یہ عبارت کندہ تھی۔ کفیٰ بالموتِ واعظاً یاعمر۔ اے عمر تیرے لیے موت کا ناصح کافی ہے۔

اور یہ امیرالمومنین علیؓ ابن ابی طالب ہیں۔ جعدہ بن ھبیرہ ان سے مخاطب ہے۔ "اے امیرالمومنین دو آدمی آپ کے پاس آتے ہیں۔ ان میں سے ایک آپ کو اپنے اہل و عیال اور مال و منال سے زیادہ محبوب رکھتا ہے جب کہ دوسرا آپ کی دشمنی میں اتنا بڑھا ہوا ہے کہ اگر اس کا بس چلے تو آپ کو ذبح کر ڈالے مگر آپ ہیں کہ دشمن کے حق میں اور دوست کے خلاف فیصلہ صادر فرما دیتے ہیں۔ حضرت علیؓ نے سن کر فرمایا۔ جانبداری کا رویہ تو میں اس صورت میں اختیار کر سکتا ہوں جب ذاتی منفعت میرے پیشِ نظر ہو مگر میرے تو سب کام اللہ

کے لیے ہوتے ہیں۔

امام شعبیؒ کہتے ہیں حضرت علیؓ کی زرہ گم ہو گئی۔ آپ کو معلوم ہوا کہ وہ ایک عیسائی کے پاس ہے۔ چنانچہ اُسے عدالت میں طلب کیا گیا۔ حضرت علیؓ نے بیان دیا کہ یہ زرہ میری ہے۔ میں نے اسے فروخت کیا ہے نہ ہدیۃً کسی کو دی ہے۔ قاضی شریح نے عیسائی سے کہا امیرالمومنین نے جو کچھ بیان کیا ہے اس کے بارے میں تم کیا کہتے ہو۔ عیسائی نے جواب دیا کہ زرہ میری ہے اور امیرالمومنین محض جھوٹ بول رہے ہیں۔ قاضی نے جناب امیر کی طرف توجہ کی اور دریافت کیا آپ کے پاس کوئی ثبوت ہے؟ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ مُسکرا دیے اور فرمایا ثبوت تو میرے پاس کوئی نہیں۔ قاضی نے فیصلہ دے دیا کہ زرہ کا مالک عیسائی ہے، وہ زرہ لے کر چلا گیا۔ ابھی چند ہی قدم گیا تھا کہ پھر پلٹ آیا اور کہنے لگا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ عین انبیاء و رسل کی تعلیمات ہیں ـ امیرالمومنین عدالت کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اپنے قاضی سے فیصلہ طلب فرماتے ہیں۔ مگر قاضی ان کے حق میں فیصلہ کرنے کے بجائے ان کے خلاف فیصلہ کر دیتا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اے امیرالمومنین اس میں کچھ شک نہیں کہ زرہ آپ ہی کی ہے۔ آپ صفین جا رہے تھے کہ راستے میں آپ سے گر گئی تھی۔ حضرت علیؓ نے یہ سُنا تو فرمایا۔ "اب جب کہ تم نے اسلام قبول کر لیا ہے جاؤ میں نے آپ کو یہ زرہ بخش دی۔

یہ دولتِ ایمان سے مالا مال ضمیر تھا جو خلیفہ اور قاضی دونوں کی رہنمائی کر رہا تھا۔ خلفاء نے کبھی یہ کوشش نہ کی کہ قوت کے بل بوتے پر اپنا حق وصول کریں یا قاضی پر کسی طرح کا اثر ڈالیں تاکہ وہ فیصلہ ان کی مرضی کے مطابق دے۔ اسی طرح قاضی نے بھی یہ نہیں کیا کہ خلیفہ کی رضاجوئی کے لیے انصاف کا خون کرے۔ اسے اگرچہ یقین تھا کہ خلیفہ سچ کہتا ہے مگر تقاضائے عدل و انصاف یہ تھا کہ امیر و مامور دونوں کے ساتھ قانون کے مطابق مساوی برتاؤ کیا جائے۔

اور یہ اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ہیں جن کے بارے میں مالکؒ بن دینار کہا کرتے تھے۔ "لوگ کہتے ہیں کہ مالک بڑا پرہیزگار ہے، میں بھلا کیونکر پرہیزگار ہوا۔ پرہیزگار تو عمر بن عبدالعزیزؒ ہیں جن کے پاس دنیا مُنہ کھولے ہوئے آئی مگر انھوں نے اُسے جھٹک دیا۔

خلفائے بنی امیہ میں یہی وہ خلیفہ راشد تھے جن کے پاس صرف ایک قمیص تھی، میلی ہو جاتی تو اسی کو دھونے کے لیے دے دیتے اور جب تک وہ خشک نہ ہو جاتی آپ گھر پر ہی قیام فرماتے۔

ایک دن اپنے گھر تشریف لائے اور اہلیہ سے ایک درہم قرض مانگا تا کہ انگور خرید سکیں۔ مگر محترمہ کے پاس بھی نام خدا ہی تھا وہ کہاں سے دیتیں۔ کہنے لگیں آپ اچھے امیرالمومنین ہیں، آپ کے خزانوں میں انگور خریدنے کے لیے بھی کچھ نہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا: "میرے لیے آج محروم رہنا گوارا اور آسان ہے بہ نسبت اس کے کہ کل نارِ جہنم کے طوق و اغلال میری گردن میں ہوں۔"

آپ نے اپنے مختصر سے دورِ حکمرانی میں اس امر کی بھرپور کوشش کی کہ مظالم کا سلسلہ بند کر دیں اور حق داروں کو ان کے غصب شدہ حقوق لوٹا دیں۔ ان کی طرف سے روزانہ ایک منادی یہ اعلان کیا کرتا تھا: "مقروض کہاں ہیں؟ تنگدست جو نکاح کے خواہش مند ہیں کہاں ہیں؟ یتامیٰ اور مساکین کہاں ہیں؟ میرے پاس آئیں تاکہ سب کی ضروریات پوری کر دوں۔ اس بے نظیر عدل و انصاف، کمال درجہ کے زہد و پرہیزگاری اور شدید نفسانی ریاضت کے باوجود آپ اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑا کر دعا کیا کرتے تھے: "اے اللہ عمر میں یہ اہلیت نہیں کہ تیری رحمت کا حق دار ثابت ہو سکے۔ لیکن تیری رحمت اتنی وسیع ضرور ہے کہ عمر کو اپنے دامن میں ڈھانپ لے۔"

مسلمان امراء و حکام کے اندر یہ خدا خوفی کہاں سے آئی تھی؟ وہ مفادِ ملت کے پاسبان اور عدل و انصاف کے پیکر کیوں بن گئے تھے۔ صرف اس لیے کہ اپنا احتساب آپ کرنا ان کا شعار تھا اور اسی خود احتسابی کا نام ضمیر ہے۔ ضمیرِ بیدار کے امثلہ و شواہد کا بیان کچھ طویل ہوتا جا رہا ہے، لیکن ہم نے شروع میں عرض کیا تھا کہ زندگی کے ہر موڑ پر اور ہر میدان میں نورِ ایمان سے منور ضمیر انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے بعض شعبہ ہائے حیات سے متعلق مثالیں ہم پیش کر چکے ہیں اور بعض کا بیان ابھی باقی ہے۔

تجارت اور آپس کے لین دین میں ایک بندۂ مومن کا ضمیر اسے کس حد تک آمادۂ نفع و خیر خواہی رکھتا ہے اس کا اندازہ حسبِ ذیل واقعات سے کیجیے:-

امام غزالی نے احیاء العلوم میں نقل کیا کہ حضرت یونس بن عبید پارچات فروخت کیا کرتے تھے۔ ان کے پاس موجود بیش قیمت پارچات میں سے بعض کی قیمت چار سو درہم تھی اور بعض کی دو سو درہم۔ آپ اپنے بھتیجے کو دکان پر بٹھا کر خود نماز پڑھنے کے لیے تشریف لے گئے۔ ان کی عدم موجودگی میں ایک بدو آیا اور چار سو درہم والا حُلّہ طلب کیا۔ آپ کے بھتیجے نے دو سو درہم والا حُلّہ دکھایا جسے بدو نے پسند کیا اور خرید لیا۔ ابھی وہ چند ہی قدم گیا تھا اور حُلّہ بھی اس کے ہاتھوں ہی میں تھا کہ سامنے سے حضرت یونس بن عبید آ گئے۔ آپ نے حُلّہ پہچان لیا اور سمجھ گئے کہ ان کی دکان سے خریدا گیا ہے۔ پوچھا کتنے میں خریدا۔ بدو نے کہا چار سو درہم میں۔ آپ نے فرمایا مگر اس کی قیمت تو دو سو درہم ہے۔ آؤ

اور یہ حلہ واپس کر دو، بدّو نے جواب دیا لیکن ہمارے علاقے میں تو اس کی قیمت پانچ سو درہم ہے اور میں چار سو میں خرید کر راضی ہوں۔ حضرت عبید نے کہا بھائی میرے ساتھ آیئے دین میں نصیحت و خیر خواہی کو دُنیا بھر کے مال ومنال سے بہتر قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ آپ اسے دُکان پر لے آئے اور دو سو درہم واپس کئے اور اپنے بھتیجے کو ڈانٹتے ہوئے کہا کہ تمہیں شرم نہ آئی، سو فیصد منافع لیتے ہوئے تم نے خدا کا خوف نہ کیا۔ تمہیں مسلمانوں کی خیر خواہی کا مطلق خیال نہ آیا۔ بھتیجے نے کہا "چچا جان! خدا کی قسم یہ صاحب تو چار سو درہم دے کر بھی راضی تھے"۔ "مگر تم جو قیمت اپنے لیے پسند کرتے ہو وہی اس کے لیے کیوں نہ کی"؟ حضرت عبید نے جواب دیا۔

ہو سکتا ہے آپ سوچ رہے ہیں کہ خیر خواہی کا یہ احساس صرف قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے اندر ہی موجود تھا۔ یہ سوچ درست نہیں۔ اس گئے گزرے زمانے میں بھی بہت سے روشن ضمیر ایسی اعلیٰ روایات کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنے ایک مقالہ میں تحریر فرمایا کہ حجاز کے ایک ثقہ بزرگ سے مجھے معلوم ہوا کہ مکہ کے تجار اپنے کاروباری ساتھیوں کے ساتھ حد درجہ اخلاص و ایثار کا برتاؤ کرتے تھے۔ اگر کسی تاجر کے پاس دن کے آخری حصے میں کوئی گاہک آتا اور تاجر یہ سمجھتا کہ آج میرا کافی مال فروخت ہو گیا ہے مگر فلاں دکان دار کی بکری بہت کم رہی ہے تو گاہک کو مشورہ دیتا کہ اس بازار میں فلاں دکان دار کے پاس وہ مال موجود ہے جو آپ مجھ سے خریدنا چاہتے ہیں آپ براہِ کرم وہاں تشریف لے جائیں۔ یوں ہر تاجر دوسرے کی خیر خواہی کرتا۔

آخر میں ایک دو واقعات بذل و انفاق کے بھی سُن لیجیے جن سے پتہ چلتا ہے کہ ایک باایمان اور باضمیر شخص کے نزدیک مال و دولتِ دُنیا کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ وہ اپنی ذات پر خرچ کرنے کے بجائے دوسروں پر خرچ کر کے زیادہ راحت اور خوشی محسوس کرتا ہے ——— امام مالکؒ نے موطا میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ ایک مسکین نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے سوال کیا جب کہ آپ روزہ سے تھیں اور گھر میں سوائے ایک روٹی کے اور کچھ نہ تھا۔ آپ نے اپنی کنیز کو حکم دیا کہ جاؤ اسے وہ روٹی دے دو۔ اس نے کہا تو پھر روزہ افطار کرنے کے لیے آپ کے واسطے کچھ نہ رہے گا۔ آپ نے فرمایا بس اسے وہ روٹی دے دو۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ ممکن ہے کوئی آدمی یہ خیال کرے کہ روٹی معمولی چیز تھی، اس لیے آپ نے اپنی ذات پر مسکین کو ترجیح دی تو ایسے حضرات کے لیے ہم اُمّ المومنین حضرت عائشہ ہی کا ایک اور واقعہ بیان کرتے ہیں۔

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک دفعہ اسی ہزار درہم حضرت عائشہ کی خدمت میں بھجوائے۔ اس وقت بھی آپ روزہ سے تھیں اور ایک پرانا سا لباس آپ نے زیب تن کر رکھا تھا۔ درہم وصول کرنے کے بعد اسی وقت

حضرت عائشہؓ نے انہیں فقرا اور مساکین میں تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ ایک درہم بھی باقی نہ رہا۔ اُن کی خادمہ نے کہا۔ "ام المومنین آپ ایک دو درہم کا گوشت ہی خرید لیتیں تاکہ ہمارے لیے رات کا کھانا تیار ہو جاتا اور آپ کی افطاری کا سامان بھی۔ ام المومنین نے فرمایا بیٹی پہلے ذکر کیا ہوتا تاکہ میں کچھ بچا لیتی"۔ تو آپ نے غور فرمایا کہ وہ روزہ دار تھی جس نے ایک روٹی کے لیے اپنے اوپر ایک مسکین کو ترجیح دی۔ جب اس کے قبضے میں اسی ہزار درہم آئے تو اُس وقت بھی فقرا و مساکین ہی کو اپنی ذات پر مقدم رکھا۔

امیرالمومنین حضرت عمرؓ بن الخطاب نے چار سو دینار ایک تھیلی میں باندھ کر اپنے لڑکے سے کہا کہ انہیں ابوعبیدہؓ بن الجراح کو میری طرف سے دینا، پھر دیکھنا وہ اس رقم کو کیا کرتے ہیں۔ لڑکا ان کی خدمت میں پہنچا اور عرض کی، امیرالمومنین نے فرمایا ہے کہ آپ یہ رقم قبول فرمائیں اور اپنی کوئی ضرورت پوری کر لیں۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے کہا اللہ امیرالمومنین پر رحم فرمائے اور انہیں میل ملاپ کی توفیق دیے رکھے۔ بعد ازاں انہوں نے ایک لڑکی کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ یہ سات دینار فلاں آدمی کو دے آؤ، اور یہ پانچ دینار فلاں صاحب کے لیے لے جاؤ، اور یہ پانچ فلاں کے لیے، اسی طرح بھجواتے گئے تاآنکہ سب ختم ہو گئے۔ لڑکا واپس آیا اور حضرت عمرؓ کو اس کی خبر دی۔ کیا دیکھتا ہے کہ حضرت عمر نے اتنے ہی دینار حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے گن رکھے ہیں۔ لڑکے سے کہا جاؤ یہ چار سو دینار معاذؓ بن جبل کو دو، اور پھر گھر کے کسی کام میں مشغول ہو جانا اور دیکھنا کہ وہ اس رقم کو کیا کرتے ہیں۔ لڑکا ان کی خدمت میں پہنچا اور عرض کی امیرالمومنین فرماتے ہیں۔ اُس رقم کو اپنی کسی ضرورت کے پورا کرنے میں صرف کر لیں۔ آپ نے رقم قبول فرمالی اور کہا اللہ امیرالمومنین پر رحم فرمائے اور انہیں ربط و تعلق قائم رکھنے کی توفیق دے۔ پھر ایک لڑکی کو بلایا اور حکم دیا جاؤ فلاں آدمی کے گھر اتنے دینار دے آؤ، فلاں آدمی کے گھر اتنے اور فلاں کے گھر اتنے۔ آپ تقسیم فرما رہے تھے کہ آپ کی اہلیہ کو خبر ہوئی انہوں نے آکر کہا واللہ ہم بھی تو غریب ہیں، ہمیں بھی کچھ دیجیے۔ اُس وقت کپڑے میں صرف دو دینار رہ گئے تھے۔ حضرت معاذ نے وہ گھر والوں کی طرف پھینک دیے۔ لڑکے نے جا کر ان کے متعلق بھی اطلاع کی۔ سن کر امیرالمومنین بہت خوش ہوئے اور فرمایا یہ سب بھائی بھائی ہیں ایک دوسرے کے مشابہ اور ایک دوسرے کے لیے مثال۔

ایک دفعہ حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قافلہ تجارت مدینے میں وارد ہوا۔ قافلہ اتنا بڑا تھا کہ پورے مدینہ میں ہلچل مچ گئی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے شور و غوغا سنا تو پوچھا کیا ماجرا ہے؟ انہیں بتایا گیا کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا قافلہ تجارت آیا ہے۔ اس پر حضرت عائشہؓ نے حدیث بیان کی

کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا، آپ فرما رہے تھے کہ میں ایسے دیکھتا ہوں جیسے میں اور عبدالرحمن بن عوف پُل صراط پر اکٹھے ہوں۔ عبدالرحمن نیچے کی طرف مائل ہونے لگتے ہیں مگر پھر سیدھے ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ بچ جاتے ہیں، اگرچہ قریب تھا کہ........ جب یہ حدیث حضرت عبدالرحمن بن عوف کو پہنچی تو انہوں نے فرمایا: "جتنے اونٹ سامانِ تجارت لے کر آئے ہیں یہ سب اور ان پر جو سامانِ تجارت لدا ہوا ہے وہ بھی اللہ کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں۔ راوی نے بیان کیا کہ جو سامانِ تجارت اونٹوں پر لدا ہوا تھا وہ اونٹوں سے زیادہ مالیت کا تھا اور اونٹوں کی تعداد پانچ سو تھی۔

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں لکھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ایک صاحب کی خدمت میں بکری کی سری ہدیۃً بھیجی گئی۔ انہوں نے قبول کر لی، پھر فرمایا فلاں آدمی مجھ سے زیادہ ضرورت مند ہے، چنانچہ اس کی طرف بھیج دی۔ انہوں نے قبول کر کے ایک اور صاحب کے ہاں بھجوا دی جو ان کے خیال میں زیادہ حاجت مند تھا۔ اس طرح ہر وصول کرنے والا بکری کی سری کو آگے بھیجتا رہا حتیٰ کہ وہ پلٹ کر پھر پہلے صحابی کے پاس پہنچ گئی۔

اہلِ ایمان کا یہ بذل و انفاق اور اپنی ضرورت پر دوسروں کی ضرورت کو مقدم رکھنے کا احساس ایمان و ضمیر ہی کی بدولت پیدا ہوتا ہے اور اسی کی پیہم ترغیب و تحریک سے برقرار رہتا ہے۔

آدم خوری

(از ــــ سید اسعد گیلانی)

انسان اجتماعی زندگی کا عادی ہے اور جنگلوں اور غاروں میں تنہائی کی زندگی اس کی فطرت کے خلاف ہے۔ ویسے بھی آخرت کے نقطۂ نظر سے دُنیوی زندگی میں اس کے امتحان کا تعلق اجتماعی زندگی اور اس کے دیگر لوازمات سے ہی وابستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تجرّد کے بجائے عائلی زندگی سے انسانی نسل کا آغاز کر کے اجتماعیت کو اس کی فطرت میں داخل کر دیا ہے۔ اخلاقِ فاضلہ کی ترقی و نشوونما بھی اجتماعی زندگی پر ہی منحصر ہے اور انسان ضبطِ نفس، تزکیۂ نفس اور طہارتِ نفس کے مختلف مدارج طے کر کے انسانیت کے اعلیٰ مدارج پر اجتماعی زندگی میں حقوق و فرائض کی بہتر اور عمدہ ادائیگی سے ہی فائز ہو سکتا ہے۔

لیکن اجتماعی زندگی کی بیماریاں بھی بہت سی ہیں۔ افراد کو اللہ تعالیٰ نے کم و بیش صلاحیتوں اور خصوصیات کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ ذہانت، محنت، صحت، دولت، جذبۂ خلوص، جرأت و شجاعت، ایثار و قربانی غرض بے شمار خوبیاں انسانوں میں مختلف مقداروں میں تقسیم ہیں۔ ان مقداروں کی کمی بیشی میں انسان اللہ کی قدرت، مصلحت اور حکمت بھی تلاش کر سکتا ہے اور اپنا اور دوسروں کا حاسدانہ مقابلہ کر کے اخلاقِ رذیلہ کی مختلف بیماریوں میں بھی مبتلا ہو سکتا ہے۔ اللہ کے رسولؐ جانتے تھے کہ انسان میں ایسی کمزوریاں طبعاً موجود ہیں۔ چنانچہ انہوں نے نفسیاتِ انسانی کے بگاڑ کا حکیمانہ علاج کرنے کے لیے ایک عظیم کلمۂ حکمت نصیحت کے طور پر فرمایا۔

"دین کے معاملے میں اپنے سے اوپر دیکھو اور دُنیا کے معاملے میں اپنے سے نیچے کی طرف"

اگر کوئی شخص یہ ایک ہی کلمۂ حکمت اپنی زندگی کا موٹو بنا لے تو وہ متعدد اجتماعی بیماریوں میں مبتلا ہونے سے بچ سکتا ہے۔ جن میں ایمان کو جڑ سے مونڈ دینے والی بیماری حسد بھی شامل ہے۔ پھر رشک، مقابلۂ دل کی جلن اور تپش بھی ہیں۔ دُنیاداری میں مسابقت کا جذبہ، معیارِ زندگی کی دوڑ، دوسروں کے مقابلے میں اپنی برتری کا احساس و اظہار اور ان چیزوں کے ساتھ ساتھ فتنۂ معاصرت اور فتنۂ مناصب بھی شامل ہیں۔ جب یہ اجتماعی بیماریاں کہیں پیدا ہو جائیں تو ان کے نتیجے میں ایک نہایت گھناؤنی، مکروہ، متعفن اور ناپاک بیماری نمودار ہوتی ہے جسے غیبت کہتے ہیں۔ یا موزوں ترین الفاظ میں جسے "آدم خوری" بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ میٹھا زہر منہ سے نکلتا، کان میں ٹپکتا اور دل کو زخمی کر دیتا ہے۔ اس کے اثرات بڑھ جائیں تو اس سے اجتماعی زندگی کا ماحول بجھا بجھا اور کھنچا کھنچا رہنے لگتا ہے۔

انسانی گوشت بڑا لذیذ ہے۔ اگر کسی کو انسانی گوشت کی چاٹ پڑ جائے تو پھر اس سے بہ مشکل چھوٹتی ہے۔ ایسا شخص پھر اپنے ہم پیشہ اور ہم احساس افراد کی تلاش میں لگ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ معاشرے کی بے حسی اور دوسروں کی آبرو سے بے نیازی سے فائدہ اٹھا کر پوری بیدردی اور بھیانک طریقے سے اجتماعی آدم خوری کا ایک سلسلہ ایک مشغلہ کی صورت میں شروع ہو جاتا ہے۔ دنیا کی بدترین، غلیظ ترین اور ناپاک ترین عادات بد میں سے یہ آدم خوری (غیبت) سب سے بدتر اخلاقی بیماری ہے۔ یہ انسان کی دماغی خباثت کی بجھڑتی ہوئی متعفن پیپ کا مظہر ہوتی ہے۔

غیبت کی یہ بدعادت انسانوں کے تعلقات کو تباہ کرنے والی، انسانی عزوشرف کو برباد کرنے والی اور انسانوں کے دلوں کو پھاڑ کر انہیں ایک دوسرے سے بہت دور کر دینے والی انتہائی گھناؤنی اور زہریلی حرکت ہے۔ قرآن کی تشبیہ میں اُسے اپنے بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے میں بھی اسے آدم خوری کا نام ہی دیتا ہوں۔

ہمارا موجودہ معاشرہ اسلامی اخلاقی اقدار سے بتدریج اور مسلسل محروم ہوتا چلا گیا ہے۔ اسلام کے بلند معیارِ اخلاق سے محرومی کے سبب اس میں شجاعت و جرات کے بجائے ڈرپوک پن آ گیا ہے اور آدم خوری کی اس بیماری کے لیے ڈرپوک پن کا ماحول بہت سازگار رہتا ہے۔ بعض اوقات یہ بیماری مروجہ اصطلاح میں دنیادار لوگوں کے مقابلے میں دین دار لوگوں میں زیادہ آسانی سے پرورش پا جاتی ہے۔ یہ روئی میں سلگتی آگ کی مانند پھیلتی جاتی ہے اور اکثر حالات میں جو شخص یارانِ جفا پیشہ کے دندانِ آز کا شکار اور لوگوں کی ضیافتِ طبع کا نشانہ بن رہا ہوتا ہے وہی اس صورتِ حال سے سب سے زیادہ بے خبر بھی ہوتا ہے۔

بلاشبہ حرام خوری بھی ایک مکروہ حرکت ہے۔ لیکن آدم خوری تو ابنِ آدم کے لیے پستی کا اسفل ترین درجہ ہے۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے موجودہ معاشرے میں آدم خوروں کی ایک کثیر تعداد موجود ہے۔ ہر کہیں آدم خوری پائی جاتی ہے۔ اور لوگ اس قبیح عادت میں اس طرح مبتلا ہو جاتے ہیں جیسے وبائے عام کے دنوں میں کھانسی، نزلہ اور ملیریا پھیل جاتا ہے۔ کوئی مجلس آدم خوروں سے خالی نہیں ہوتی اور جہاں کہیں دو چار آدمی جمع ہوں ان میں کوئی نہ کوئی آدم خور ضرور سرپا پایا جاتا ہے۔ یہ وبا ایسی عام ہوئی ہے کہ بستیاں، بھیڑیوں اور درندوں کے بھٹ بن کر رہ گئی ہیں۔ یہی وہ آدم خوری ہے جسے قرآن نے اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف قرار دیا ہے۔

اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ (الحجرات - ۱۲)

ترجمہ: بھلا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھائے؟ دیکھو، تم خود اس سے نفرت کرتے ہو۔ اللہ سے ڈرو وہ رجوع فرمانے والا اور رحیم ہے۔

دُنیا کی دیگر قوموں کے لیے اجتماعیت قائم کرنے کی بہت سی بنیادیں ہیں۔ کہیں قومیت کی بنیاد نسل ہے۔ کہیں وطن ہے۔ کہیں زبان اور رنگ ہے۔ غرض کئی قسم کے محسوس اور مادی اشتراک سے قومیں وجود میں آجاتی ہیں۔ لیکن مسلم قوم جو معاشرہ وجود میں لاتی ہے اس کے پاس ان میں سے کوئی ایک وجہ بھی قومیت کی بنیاد نہیں بن سکتی اور اگر کہیں کوئی مسلم آبادی ان وجوہ میں سے کسی ایک کو قومیت کی بنیاد بنانا بھی چاہے تو بالآخر وہ ملت اسلامیہ کے بین الاقوامی وجود سے کٹ جاتی ہے۔ مسلم ملت کے بنیادی عوامل تو توحید و رسالت کا اقرار اور اسلام کے معروفات پر عمل اور منکرات سے اجتناب کا اہتمام ہے۔ انہیں عوامل سے ایک مخصوص تہذیب ایک مخصوص سانچہ اور ایک مخصوص طرز کا انسان وجود میں آتا ہے۔ جسے مسلمان کہا جاتا ہے۔

مسلمانوں کا معاشرہ اپنے مزاج کے لحاظ سے خالص نظریاتی بنیادوں پر کھڑا ہوتا ہے۔ نظریات کا تعلق ہمیشہ انسان کے تصورات اور کردار سے ہوتا ہے۔ جغرافیائی، لسانی یا نسلی عوامل سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس لیے ایک مسلم معاشرے کی اجتماعیت جو نظریات اور جذبات پر قائم ہوتی ہے، جہاں ایک طرف انتہائی مضبوط ہے کہ زمان و مکان کی حدبندیاں اس کے لیے روک نہیں بن سکتیں وہاں انتہائی نازک بھی ہے کہ ظاہری محسوس عصبیتوں میں سے کوئی عصبیت بھی اس کا سہارا نہیں بن سکتی۔ جہاں خدا اور رسولؐ سے گہری محبت اور کائنات سے متعلق ایک خاص نظریہ مختلف نسل اور رنگ اور ملک کے دو انسانوں کو باہمی گہری محبت میں جوڑ دیتا ہے وہیں ان امور کا اختلاف ان دونوں کو باہمی ایسا کاٹ سکتا ہے کہ ان کی شناسائی بھی محلِ نظر ہو جائے۔ اشتراکِ نظریات و جذبات سے یہ معاشرہ وجود میں آتا ہے اور اختلافِ نظریات و جذبات سے اس کی جڑیں کٹ جاتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ معاشرے کی اجتماعی ہیئت کو منتشر اور مجروح کرنے والی تمام چیزوں کی اسلام نے شدید مذمت کی ہے۔ جھوٹ بُرا ہے کہ وہ اجتماعی ہیئت کے اندر بے اعتمادی کے جراثیم پرورش کرتا ہے۔ وعدہ خلافی اجتماعی زندگی کا اعتبار کھو دیتی ہے۔ خیانت اور بددیانتی، اجتماعی جھگڑے فساد پیدا کرتی ہے۔ غداری اور دغابازی سے معاشرے پر سخت ابتلا وارد ہو سکتا ہے۔ بہتان سے دل پھٹ جاتے اور افراد ایک دوسرے سے

کٹ جاتے ہیں۔ چغلخوری سے سینوں میں کدورتیں بھر جاتی ہیں جن کو رفع کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ غیبت اور بدگوئی سے نفرت کا زہر فرد فرد میں سرایت کر جاتا ہے۔ دو رُخے پن سے مسلمان کا مسلمان پر سے اعتماد اُٹھ جاتا ہے۔ بدگمانی سے دلوں کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ خوشامد سے انسان ذلیل و پست ہو جاتا ہے۔ بُخل سے طبیعت میں کمینہ پن آ جاتا ہے۔ فخر و غرور سے انسان ہمدردیوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ غرض وہ سب باتیں جو انسانی نفسیات کو پراگندہ کر کے اجتماعیت کو بگاڑنے والی ہیں ان سب پر اسلام نے "رذائلِ اخلاق" اور "منکرات" کا لیبل لگا کر انہیں اسلامی معاشرے میں پرورش پانے سے روک دیا ہے۔ اور جو کوئی ان میں سے کسی بھی اجتماعیت کش بیماری کو پرورش کرتا ہوا نظر آئے اس پر سختی سے نگاہ رکھنے اور بازپرس کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اور معاشرے کا اجتماعی مزاج ایسے سانچے میں ڈھال دیا ہے کہ ایسے مکروہات کی مزاحمت کرے اور جو کوئی اس آفت میں مبتلا ہو جائے اس کی ہمت شکنی بھی کرے اور اسے معاشرے میں نکّو بنا کر رکھے۔

اخلاق کی ان بھیانک بیماریوں میں جن میں سے ہر ایک اجتماعیت پر سخت وار کرنے والی اور مسلمان کو مسلمان سے توڑنے والی ہے بدترین بیماری غیبت نجویٰ اور بدگوئی ہے یعنی کسی کو اس کی پیٹھ پیچھے بُرا کہنا۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی اجتماعیت کو جس قدر نقصان اس سے پہنچتا ہے اتنا نقصان کالا ناگ بھی اپنے شکار کو نہیں پہنچا سکتا۔

اس کا سب سے پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ یہ بیماری متعدی ہو جاتی ہے۔ ایک سے دوسرے کو اور دوسرے سے تیسرے کو لگتی ہے۔ ہر ایک کبھی ہمدردی، کبھی افسوس، کبھی تاسف، کبھی غصے اور کبھی اصلاح کی نیتِ خیر سے گندگی کی اس پوٹ کو چپکے چپکے معاشرے کے مختلف افراد کے درمیان لڑھکاتا چلا جاتا ہے۔ شخصِ متعلق جو زیر بحث ہوتا ہے ممکن ہے کہ اس آفت سے کافی عرصے تک واقف نہ ہو کر اس کے گوشت کو یار لوگ مزے سے چپکے چپکے تناول فرما رہے ہیں۔ بالعموم وہ آخری آدمی ہوتا ہے جسے اطلاع ملتی ہے کہ اس میں فلاں خرابی ہے جو مجالس میں زیر بحث ہے۔ لیکن وہ خود اس کی طرف سے بے خبر ہے۔ جب اسے خبر ہوتی ہے تو جس ذات شریف نے اس کے بارے میں گندگی کی پوٹ لڑھکائی تھی وہ کتنوں کے ہی دامنوں کو آلودہ اور دلوں کو کبیدہ کر چکی ہوتی ہے اور اس کے بس سے یہ بالکل ہی باہر ہوتا ہے کہ وہ نامعلوم افراد کے دلوں کے نامعلوم کانٹے چُنتا پھرے۔ اور اگر چُنے بھی تو اس کی اس کوشش کو مخلصانہ سمجھا جائے گا یا مشتبہ، یہ خود اس پر بھی واضح نہیں ہوتا۔ چنانچہ کانٹے بکھرتے رہتے ہیں اور دلوں میں چُبھتے رہتے ہیں یہاں تک کہ معاشرے کے اندر اس شخص کا حلقۂ تعارف اس کے لیے بھڑوں کا چھتہ بن جاتا ہے اور ہر راستہ کانٹوں سے پُر ہو جاتا ہے۔ اس کی مدد کرے تو کون کرے؟ اگر شبہات کا شیطان مددگار

پر بھی حملہ کر دے تو پھر کیا ہو؟ یہ خدشات قائم رہتے ہیں اور وہ شخص شک و شبہ کے پتھروں سے سنگسار ہوتا رہتا ہے اس اجتماعی نفسیاتی بیماری کا علاج کسی کے بس میں نہیں ہوتا اور جب ظالم نے اپنے بھائی کا گوشت معاشرے میں تقسیم کیا ہوتا ہے اگر اس کا چہرہ تانبے کے ناخنوں سے بھی نوچا جائے اور اس کی انتڑیاں تانبے کی سلاخوں سے بھی نکال نکال کر پھینک دی جائیں اور یہ عمل برسوں تک ہو تو بھی یہ انفرادی سزا اس اجتماعی کوفت اور تکلیف کا مداوا نہیں بن سکتی جو مجرم کی زبان کے چند غیر محتاط اور زہریلے الفاظ نے کسی کو پہنچائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضورؐ نے اس قبیح حرکت کو زنا سے بدتر قرار دیا ہے۔

حضرت ابو سعید خدریؓ اور جابرؓ بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا "غیبت زنا سے بدتر ہے" صحابہ نے عرض کیا "یا رسول اللہ زنا سے زیادہ بُری کیونکر ہو سکتی ہے" آپ نے فرمایا "آدمی زنا کرتا ہے پھر توبہ کرتا ہے اور خداوند تعالیٰ اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے اور ایک روایت میں ہے کہ پھر زانی توبہ کرتا ہے اور اللہ اس کو بخش دیتا ہے، لیکن غیبت کرنے والے کو خدا نہیں بخشتا جب تک کہ وہ شخص اس کو معاف نہ کر دے جس کی اس نے غیبت کی ہے" حضرت انسؓ کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ "زانی توبہ کرتا ہے لیکن غیبت کرنے والے کے لیے توبہ نہیں ہے" (بیہقی)

جو شخص کسی کی غیبت کرتا ہے حقیقت میں وہ اس کی عزت اور آبرو کو اس کی غیر موجودگی میں معاشرے میں جگہ جگہ نوچتا پھرتا ہے جب کہ وہ غریب ایک مُردے کی سی بے بسی سے اپنی مدافعت بھی نہیں کر سکتا۔ یہی اس کی عزت و آبرو کو جگہ جگہ نوچنے کا فعل ہے جس کی سزا کو تمثیلاً حضورؐ نے معراج کے موقعہ پر دیکھا۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔

"جب مجھے معراج کرایا گیا میں ایسی قوم کے پاس سے گزرا جن کے تانبے کے ناخن تھے وہ اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ رہے تھے۔ میں نے کہا جبریلؑ یہ کون لوگ ہیں انہوں نے جواب دیا یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے اور ان کی آبروریزی کرتے ہیں" (ابوداؤد)

غیبت جس کی بھی کی جاتی ہے اس کی بے خبری اور پیٹھ پیچھے کی جاتی ہے اس وجہ سے اس کے لیے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ اپنے خلاف کہی جانے والی بات کی تردید کر سکے یا اس کی صحیح صحیح نوعیت جان سکے اور حقیقت کی وضاحت کر سکے۔ اس لیے جو بھی اس کے بارے میں کوئی بات سُنتا ہے اگر ناپختہ مزاج ہوتا ہے تو اس کے دل میں بھی کچھ نہ کچھ کدورت اور غبار اس کی طرف سے پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسے بہت کم بلکہ شاذ و نادر ہی لوگ پائے جاتے ہیں جو مخاطب کی بات سُن کر اس پر گرفت کریں، اس سے ثبوت طلب کریں یا اسے پکڑ کر اس شخص کے پاس رُو در رُو لے جائیں جس کی غیبت

کی جا رہی ہوتی ہے۔ حالانکہ معاشرے کے افراد میں یہی چیز مطلوب ہے جو معاشرے کو غیبت کی زہریلی بیماری سے بچا سکتی ہے۔ چنانچہ یہ کدورت آگے چل کر غیر محسوس طور پر انقباض، کراہت اور بالآخر نفرت کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور غیبت کرنے والے نے جو شبے کا بیج بویا تھا وہ نفرت کا درخت بن کر اور تعلقات کی سخت کشیدگی کے برگ و بار لاتا ہے۔

سینے کدورتوں سے بھر جاتے ہیں اور دل خلوص و محبت سے خالی اور مہر و وفا سے تہی ہو کر بجھ جاتے ہیں اور کوئی بڑا سے بڑا انسان بھی عالم الغیب نہیں ہوتا کہ معاملے کی صحیح صورت کو جان سکے۔ اسی لیے حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے روایت ہے کہ حضورؐ اکرم نے فرمایا۔

"میرے اصحاب میں سے کوئی کسی کے بارے میں مجھے کوئی بات نہ پہنچائے۔ اس لیے کہ میں چاہتا ہوں کہ میری ملاقات تم لوگوں سے اس حال میں ہو کہ میرا سینہ ہر ایک سے صاف ہو۔" (ترمذی)

زبان کی حفاظت ایک بڑا مشکل امر ہے اور انسان جب کسی سے کسی بنا پر کبیدہ خاطر ہوتا ہے تو اس کے بارے میں اس کی زبان کا محفوظ رہنا بڑا مشکل کام ہو جاتا ہے۔ اس لیے حضرت سہیلؓ بن سعد کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا ہے۔

"جو شخص مجھ سے اس کا عہد کرے کہ وہ اپنے دونوں کلّوں کے درمیان کی چیز (زبان) اور اپنے دونوں پاؤں کے درمیان کی چیز (شرم گاہ) کی حفاظت کرے گا اور لوگوں کو بُرا نہ کہے گا، نہ کسی کی بُرائی اور غیبت کرے گا اور بدکاری اور زنا سے بچے گا تو میں اس کے لیے جنت کی ضمانت دوں گا۔" (بخاری)

چنانچہ اس کی حفاظت کے لیے حضورؐ اکرم نے ایک نفسیاتی تدابیر حضرت ابو ذرؓ کو بتائی۔ جب وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا۔

"جب کسی کی عیب گیری کا خیال تیرے دل میں پیدا ہو تو اس کے اظہار سے تجھ کو یہ خیال روک دے کہ مجھ میں بھی کچھ عیب ہیں۔" (بیہقی)

ایک دوسرے موقع پر جیسی بات سُنی ویسی ہی آگے چلا دینے کی عادت کو روکنے کے لیے حضورؐ نے فرمایا۔

"انسان کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ جو کچھ سُنے اسے بلا تحقیق آگے بیان کر دے۔" (مشکوٰۃ)

اور یہ کہ

"قیامت کے دن اللہ کے نزدیک بہت بُرے لوگوں میں تم ان کو پاؤ گے جو دو رُخے ہوں۔ یہاں اُس کی بات کر دی اور وہاں اس کی بات کر دی۔" (نسائی)

اور یہ کہ حضورؐ نے فرمایا۔

"میں تمہیں بتاؤں کہ سب سے بُرے لوگ کون ہیں، پھر فرمایا جو چغلیاں کھاتے پھرتے ہیں اور دوستوں کے آپس کے تعلقات خراب کرتے پھرتے ہیں" (مسند احمد)

یہ متعدی مرض جو چھوت کی طرح ایک سے دوسرے کو لگتا ہے اور حسنِ ظن کی فضا میں بعض اوقات اس لیے زیادہ پروان چڑھ جاتا ہے کہ کہنے والا درست ہی کہہ رہا ہوگا، اس کی تحقیق کی ضرورت کیا ہے۔ یہ اپنے اندر بہت سے نفسیاتی اثرات رکھتا ہے۔

اس کا ایک نفسیاتی اثر یہ ہے کہ بدگوئی اور غیبت کرنے والا شخص اگر سات پردوں کے اندر بھی بیٹھ کر کسی کی غیبت کرتا ہے تو کوئی غیر محسوس انسانی جذبہ دوسرے کے دل میں بھی اس شخص کی طرف سے ایک غبار پیدا کر دیتا ہے اور وہ سونگھ لیتا ہے کہ اس کے بارے میں فلاں کے دل میں ضرور ہی کچھ نہ کچھ زہر پیدا ہو گیا ہے۔ یہ چیز ایسی غیر محسوس ہے کہ اس کا تجزیہ یا تاویل کرنا بہت مشکل ہے، لیکن ہوتا یونہی ہے۔ کئی نفسیاتی اور روحانی عوامل کام کر جاتے ہیں جن کے سبب دونوں کے درمیان کدورت کی دیوار حائل ہو جاتی ہے۔ یہ دیوار پھر بڑھتی ہی چلی جاتی ہے جب تک کہ دو طرفہ صفائی کا کوئی ٹھوس انتظام نہیں ہو جاتا۔

اس کا دوسرا نفسیاتی اثر عیب چینی اور نکتہ چینی کے مرض کا ابھر آنا ہے۔ جو شخص بھی کسی کے خلاف یہ ظالمانہ زہر آلود کارروائی کر گزرتا ہے پھر یہ اس کی طبیعت ثانیہ سی بن جاتی ہے کہ جس کا ایک بار اس نے گوشت کھایا ہے پھر اُس سے اپنے کام و دہن کو بار بار آلودہ کرتا ہی رہے۔ پہلے اگر اس نے یہ کام کسی ہنگامی جذبے کے تحت کیا ہوتا ہے تو پھر وہ اسے اپنا فرض اور حق اور قطعی ضرورت سمجھ کر کرتا چلا جاتا ہے اور اس کے لیے وہ دوسرے کے کردار پر اپنی طرف سے قطعی آنکھیں بند کر کے خوردبین لگا دیتا ہے اور اس کی ایک ایک کوتاہی موہوم یا معلوم کو تلاش کر کے اس کو بڑا بناتا اور تشہیر کرتا ہے۔ پھر وہ بے دلیل دوسرے کی تذلیل اور آبروریزی کو اپنا فطری حق سمجھنے لگتا ہے۔

اس کا ایک اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ بدگوئی اور غیبت کرنے والا سخت قسم کی اخلاقی بزدلی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ اس کے بجائے کہ بات کو کھل کر صاف صاف اس کے سامنے کہے اِدھر اُدھر کہتا ہے اور اس کے بجائے کہ فریقِ معاملہ کو دلائل سے اپنے موقف پر مطمئن کرے، معاشرے کے دوسرے افراد کو جو غیر متعلق ہوتے ہیں اپنے موقف پر مطمئن کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ اس حرکت سے بعض کے درمیان وہ خود بے وزن ہو جاتا ہے اور بعض کو وقتی طور پر اپنا موافق بنا لیتا ہے۔ لیکن اسے ہمیشہ یہ خدشہ لاحق رہتا ہے کہ فریقِ معاملہ کہیں اس سے مل کر اپنی پوزیشن صاف نہ کر دے۔ یعنی اب اسے معاملے کی صفائی مطلوب نہیں ہوتی بلکہ کسی کی آبروریزی اور معاملے کی گندگی اور تعلقات کی پراگندگی

ہی مطلوب ہوتی ہے۔

ہمارے معاشرے میں یہ بیماری اتنی عام ہوگئی ہے کہ پڑھے لکھے لوگ بھی اپنی مجالس میں بطور تفریح یہ مشغلہ فرماتے دیکھے جاتے ہیں۔ کہیں مجالس میں کسی غیر حاضر کا مذاق اُڑایا جاتا ہے۔ کہیں ان کے نام دھرے جاتے ہیں۔ اور کہیں ان کے عیب گنائے جاتے ہیں۔ یہ عادت لوگوں میں پست حوصلگی، دنائت اور بازاری پن پیدا کر دیتی ہے۔ واقعۂ افک میں اسی عادت نے مسلمان معاشرے کو ہلا کر متزلزل کر دیا تھا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہایت شدید وعید آئی کہ ان کے درمیان نبیؐ نہ ہوتے تو ایسی بات پر عذاب نازل ہوگیا ہوتا۔

حقیقت یہ ہے کہ نجویٰ اور غیبت سے زیادہ اجتماعیت کو تباہ و برباد کرنے والی اور کوئی چیز نہیں ہے۔ اس سے دوست دوستوں سے اور رفیق رفیقوں سے کٹ جاتے ہیں۔ اس سے برسوں تک یکجا بھائیوں کی طرح مل کر کام کرنے والے ایک دوسرے کی ہر خوبی کی طرف سے آنکھ بند کر کے باہم ایک دوسرے کو مطعون کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ عادت آدمی کے دین و ایمان، اخلاق و خدا ترسی اور باہمی محبت و الفت کو اس طرح تراش دیتی ہے جیسے حجام کا اُسترا بالوں کو تراش دیتا ہے۔ اس سے ہم نے ہمسفروں کی تیرتی کشتیوں کو اُلٹتے اور ساتھیوں کی پُر رونق محفلوں کو اجڑتے دیکھا ہے۔ یہ ایک ایسی ظالم چیز ہے جو الفت و محبت کو نفرت سے، میل ملاقات کو جدائی سے، حُسنِ ظن کو سوءِ ظن سے، رفاقت کو عداوت سے اور کامیابی کو ناکامی سے بدل دیتی ہے۔ وہ معاشرہ جو اپنی اجتماعیت برقرار رکھنا چاہتا ہے اُس کے لیے لازم ہے کہ وہ اس زہریلی اجتماعی بیماری کی طرف سے اس طرح چوکنا رہے جیسے چوکیدار چور کی طرف سے اور سانپ لاٹھی کی طرف سے چوکنا رہتا ہے۔ اسی لیے حضورؐ اکرم نے واضح طور پر اس بیماری کی طرف اشارہ کیا۔ اور نہایت وضاحت سے بلا تشبیہ و تمثیل فرمایا کہ

"اے وہ لوگو جو زبان سے تو ایمان لائے ہو لیکن ایمان تمہارے دلوں کے اندر جاگزیں نہیں ہوا ہے تم مسلمانوں کی غیبت کرو اور نہ ان کے عیوب کی تلاش میں رہو، کیونکہ جو شخص ان کے عیوب کی تلاش میں رہے گا خداوند تعالیٰ بھی اس کے عیب تلاش کریگا اور خود اس کے گھر ہی کے اندر اس کو رُسوا کر دے گا۔" (ابو درداءؓ)

ظاہر ہے کہ کوئی شخص بھی عیبوں، لغزشوں اور کمزوریوں سے پاک ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے سوا کوئی ذات بھی پاک ذات نہیں ہے۔ تو جو شخص اپنے عیبوں سے واقف ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے مومن بھائی کو رسوا کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی جو سب عیبوں سے براہِ راست آگاہ ہے اسے رسوا کر لینے کا تہیہ کر لیتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ ہی کسی کو رُسوا کر دینے کا تہیہ کر لے تو پھر اسے رسوائی سے کون بچا سکتا ہے؟

(بقیہ اشارات) ہے اور ملک کے عوام اس کی قہرمانیوں کے چنگل میں گرفتار کراہ رہے ہیں۔ برسرِاقتدار طبقے اسے بہرحال یہی باور کرانے میں مصروف ہیں کہ یہ سب دشمنوں کی پھیلائی ہوئی بدگمانیاں ہیں و نہ قوم تو بامِ عروج تک پہنچا چاہتی ہے اور اس ملک کے رہنے والوں کو جلد ہی ناقابلِ تصور آسانیاں فراہم ہونے والی ہیں۔ عوام بیچارے جب ضروریاتِ زندگی کی کمیابی اور کمرتوڑ مہنگائی کا گلہ کرتے ہیں تو اُنہیں یہ کہہ کر مطمئن کیا جاتا ہے کہ قیمتوں میں اضافے کا رُجحان بین الاقوامی عمل کا نتیجہ ہے۔ درآنحالیکہ ان ممالک میں اضافہ کی رفتار پاکستان کے مقابلے میں نہایت ہی کم ہے اور معاوضوں کی شرح یہاں کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہے۔ دوسرے ممالک میں ضروریاتِ زندگی میں زیادہ سے زیادہ ۱۲ فی صد اضافہ ہوا ہے اور اس کے مقابلے میں مزدوروں اور دوسرے ملازمین کی تنخواہوں میں اضافہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ لیکن شاید یہاں کے حکمرانوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ انہوں نے اپنے ملک کے رہنے والوں پر ایسا جادو کر دیا ہے کہ وہ نہ تو کسی غیر ملکی اخبار کی خبر پڑھ سکتے ہیں اور نہ کسی غیر ملکی آواز کو سُننے کی قوت رکھتے ہیں اور نہ اپنے فرماں رواؤں کی باتوں اور کارناموں کا ناقدانہ جائزہ لینے کو تیار ہو سکتے ہیں۔ انہیں جو کچھ سرکارِ عالی مدار کی طرف سے پہنچتا ہے وہ اسے صحیفۂ آسمانی سمجھ کر اس پر فوراً ایمان لے آنے پر مجبور ہیں۔ دُنیا میں جتنے بھی حکمران تباہ ہوئے وہ سب اسی خوش فہمی کا شکار ہو کر تباہ ہوئے کہ وہ عوام کو دھوکہ دینے میں بڑے مشاق ہیں۔ لیکن وہ عوام کو تو کیا دھوکہ دے سکتے تھے۔ خود دھوکے میں رہ کر عجیب و غریب حرکات کا ارتکاب کرنے لگے جو بالآخر ان کی بربادی کا موجب بنیں اور ان کی اس بربادی کا سب سے زیادہ المناک پہلو یہ تھا کہ انہیں آخر دم تک اس بات کا احساس نہ ہوا کہ وہ اپنی ہی کرتوتوں سے اپنے آپ کو کس حسرتناک انجام کی طرف لے جا رہے ہیں۔ عوام کو بیوقوف بناتے ہیں وہ اپنے آپ کو بڑا ماہر اور چابکدست سمجھتے تھے اور اپنے اس فن پر وہ بڑے نازاں تھے لیکن اس فن کے المناک نتائج جب اُن کے سامنے آئے تو پھر اُنہیں ان کو دیکھنے کی تاب نہ رہی اور یہ نتائج جس قدر قوم کے حق میں مہلک ثابت ہوئے اس سے کہیں زیادہ ان کے لیے تباہی اور بربادی کا موجب بنے۔ اور انہیں دُنیا سے اس طرح نیست و نابود کر دیا گیا کہ کوئی ان کا نام لینے والا باقی نہ رہا۔ اُن کے ظلم و استبداد کی محض داستانیں رہ گئیں جنہیں سُن کر آنے والی نسلوں نے اُن پر نفرین ہی بھیجی۔

اگر ہمارے اس مُلک کے موجودہ حکمران اس قوم و ملت کے واقعی خیر خواہ ہیں جیسا کہ وہ اپنی تقریروں اور بیانات میں حلف اُٹھا اُٹھا کر کہتے رہے اور وہ اپنی ذات کی دشمنی پر بھی کمربستہ نہیں ہوئے اور اپنی اور ملک و قوم کی بربادی کا روح فرسا منظر دیکھنے کے لیے کسی صورت بھی تیار نہیں تو انہیں سب سے پہلے اپنے اس اندازِ فکر میں تبدیلی پیدا

کرنی چاہیے جس کا مظاہرہ وہ گزشتہ کئی سالوں سے کر رہے ہیں۔ کسی قوم کی سربراہی اور حکمرانی کرنی کھیل تماشہ نہیں جو محض جلسوں، جلوسوں اور اسی طرح کی دوسری ہنگامی تقریبات کے انعقاد سے یا سطحی جذباتیت کے چند مظاہروں سے کھیلا جا سکے۔ یہ ایک مقدس فرض کی ادائیگی اور ایک نہایت ہی عظیم اور بھاری ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کا نام ہے۔ جذبات کے ہنگامے انتخابات کے موقع پر تو کسی حد تک نتیجہ خیز ثابت ہو سکتے ہیں مگر کف بدہن موجوں سے نبرد آزما کسی قوم کی کشتی کو ساحل مراد پر پہنچانے کے لیے اس قسم کے حربے بالکل عبث اور بیکار بلکہ تباہ کن ثابت ہوتے ہیں۔ اجتماعی زندگی کے تلخ حقائق کا صرف بیان بازیوں اور نعرہ بازیوں سے تو مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کا سامنا کرنے کے لیے بڑی حکمت اور دانائی، خلوص اور جوش عمل کی ضرورت ہے۔ عیاریوں اور فریب کاریوں سے چند لوگوں کو کچھ وقت کے لیے تو بیوقوف بنایا جا سکتا ہے لیکن مخلوقِ خدا کو دیر تک اندھیرے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ حالات کے تھپیڑے جلد ہی اُسے خواب غفلت سے بیدار کر کے تلخ حقائق کے سامنے لا کھڑا کرتے ہیں جن سے وہ ایک لمحہ کے لیے بھی صرفِ نظر نہیں کر سکتا۔

ISLAMIC LITERATURE

—:o:—

Abul A'la Maududi

Title		Deluxe	Rs. Ps.
The Meaning of the Qur'an	Vol. I	14.00	10.00
,, ,, ,, ,, ,,	,, II	16.00	10.00
,, ,, ,, ,, ,,	,, III	18.00	10.00
,, ,, ,, ,, ,,	,, IV	30.00	16.25
Islamic Law and Constitution		19.50	13.50
Towards Understanding Islam	...	10.00	6.00
Islamic Way of Life ...	...	6.00	3.25
Purdah and the Status of Woman in Islam		18.00	10.00
A Short History of the Revivalist Movement in Islam ...	...	9.00	4.50
Birth Control	...	...	5.00
The Qidiani Problem ...	...	...	2.60
Ethical Viewpoint of Islam ...	...	...	1.60
First Principles of the Islamic State	...	...	1.50
Rights of Non-Muslims in Islamic State	..	..	1.00
Islamic Law and Its Introduction in Pakistan ...	...	...	2.25
Political Theory of Islam ...	...	...	1.10
The Process of Islamic Revolution	...	...	2.75
The Economic Problem of Man and Its Islamic Solution	...	...	1.00
The Prophet of Islam ...	.	...	1.30
Life After Death ...		.	0.60
The Religion of Truth ...	...	...	1.00
The Sick Nations of the Modern Age	...	..	0.50
The Road to Peace and Salvation	...	...	0.75
Unity of the Muslim World .	...	...	0.80

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

کیا آپ نے مولانا مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن اور دیگر تصانیف کا مطالعہ کیا؟

اگر مطالعہ نہیں کر سکے تو ہماری خصوصی رعایت سے فائدہ اٹھائیں!

	روپے	پیسے
(۱) مولانا مودودی کی تحریر کردہ اور ترجمہ شدہ تصانیف پر مشتمل مکمل اردو سیٹ کا ہدیہ	۱۱۳	۲۵
انفرادی خریدار کو دس فیصد رعایت اور ڈاک خرچ بذمہ ادارہ رعایتی قیمت	۲۸۰	۳۰
(۲) انگریزی تصانیف و تراجم ۲۱ کتب پر مشتمل مکمل سیٹ کی قیمت	۱۰۷	۲۵
انفرادی خریدار کو دس فیصد رعایت اور ڈاک خرچ بذمہ ادارہ رعایتی قیمت	۹۶	۵۵

(۳) اردو اور انگریزی کتابوں کے مکمل سیٹ منگوانے پر بیس فیصد رعایت اور ڈاک خرچ بذمہ ادارہ ہوگا۔

(۴) تفہیم القرآن یا علیحدہ علیحدہ سورتوں کے مکمل سیٹ پر پندرہ فیصد رعایت اور ڈاک خرچ ادارہ ادا کرے گا۔

ہدیہ تفہیم القرآن

تفہیم القرآن جلد اول	۳۱	۰۰
" " دوم	(زیر طبع)	
" " سوم	۳۵	۰۰
" " چہارم	۲۸	۰۰
" " پنجم	(زیر طبع)	
" " ششم	۳۲	۰۰

۱۔ سورۂ احزاب اعلیٰ ایڈیشن	۴	۵۰
۲۔ سورۂ الرحمٰن	۱	۹۰
۳۔ سورۂ لقمٰن	۱	۹۰
۴۔ الحجرات	۲	۲۰
۵۔ سورۂ نور	۶	۰۰
۶۔ سورۂ یوسف	۲	۷۵
۷۔ سورۂ المائدہ	۲	۲۵
۸۔ سورۂ الفاتحہ، البقرہ	۸	۲۵
۹۔ سورۂ الفتح	۲	۰۰

نوٹ: فہرست کتب انگریزی اور اردو طلب فرمانے پر مفت مہیا کی جائے گی نیز ایجنٹ حضرات تاجرانہ کمیشن کے لیے رابطہ قائم کریں۔

ان کے علاوہ اسلامک پبلیکیشنز کی جملہ مطبوعات بھی مہیا کی جا سکتی ہیں

خصوصی رعایت سے فائدہ اٹھانے والے حضرات رقم پیشگی ارسال فرمائیں

ادارۂ ترجمان القرآن، اچھرہ لاہور